بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسانی حقوق

اسلامی تعلیمات اور مغربی فلسفہ

ابو عمار
زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی
گوجرانوالہ، پاکستان
www.alsharia.org

جملہ حقوق محفوظ!

عنوان : انسانی حقوق: اسلامی تعلیمات اور مغربی فلسفہ
تالیف : ابوعمار زاہد الراشدی
مرتب : ناصر الدین خان عامر
ناشر : الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ
اشاعت : ستمبر ۲۰۱۲ء

فہرس

ابتدائیہ ۷

- جدید فلسفہ کا تاریخی پس منظر ۱۱
- وحی اور عقل ۱۲
- انسان سلیم الفطرت ۱۲
- یقین کا ذریعہ صرف وحی ۱۳
- نسل انسانی کا نوعی امتیاز ۱۴
- انسان مدنی الطبع ہے ۱۵
- حقوق کا اسلامی فلسفہ ۱۶
- حقوق: قرآن وحدیث میں ۱۸
- اسلام اور مغربی تہذیب میں فرق ۲۰
- انسانی حقوق اور اقوام متحدہ ۲۲
- اسلامی قوانین پر اعتراضات ۲۲

انسانی حقوق کا مغربی پس منظر ۲۴

- انقلابِ فرانس ۲۵
- اقوامِ متحدہ کا قیام ۲۶
- اقوامِ متحدہ کے اصل پالیسی ساز ۲۷
- عالمِ اسلام کے تحفظات ۲۸
- انسانی حقوق اور اسلامی شریعت ۳۰

انسانی حقوق کا عالمی منشور ۳۱

- تمہید و متن ۳۱
- دفعات (۱ تا ۳۰) ۳۲

انسانی حقوق کے مغربی تناظر اور اسلامی تناظر کا فرق ۴۰

- تمہید پر تحفظات ۴۰
- مرد اور عورت میں مساوات ۴۱
- پوری نسل انسانی کے لیے مشترکہ معیار ۴۲
- دفعہ نمبر ۱ تا ۳ (اقوام متحدہ کی دورُخی پالیسی) ۴۳
- دفعہ نمبر ۴ (غلامی کا مسئلہ) ۴۳
- بین الاقوامی معاہدات اور اسلام ۴۵
- دفعہ نمبر ۵ (اسلامی حدود و تعزیرات پر اعتراض کی بنیاد) ۴۶
- دفعہ نمبر ۶ تا ۱۵ ۴۷
- دفعہ نمبر ۱۶ (خاندانی نظام اور اسلامی تعلیمات) ۴۷
- مسلم حکمرانوں کا طرز عمل ۴۹
- امتیازی قوانین اور اسلام ۵۰
- دفعہ نمبر ۱۷ ۵۱
- دفعہ نمبر ۱۸، ۱۹ (آزادئ مذہب اور آزادئ رائے) ۵۱
- پاکستان کا اسلامی تشخص ۵۳
- قادیانی مسئلہ ۵۴
- آزادئ رائے کی حدود ۵۵
- دفعہ نمبر ۲۰ (معاشرہ کی سیاسی گروہ بندی) ۵۶
- دفعہ نمبر ۲۱ (اسلام میں حقِ حکمرانی کی بنیاد) ۵۷

- خلافت کا دستوری تصور ۵۷
- موجودہ دور میں خلافت کا انعقاد ۵۹
- خلافت وامامت کا فرق ۶۰
- دفعہ نمبر ۲۲ تا ۲۴ ۶۲
- دفعہ نمبر ۲۵ (معاشرہ کی طبقاتی تقسیم) ۶۲
- رفاہی ریاست کی بنیادیں ۶۴
- آئیڈیل ویلفیئر اسٹیٹ ۶۵
- زنا کا چور دروازہ ۶۶
- دفعہ نمبر ۲۶ تا ۲۹ ۶۷
- دفعہ نمبر ۳۰ ۶۷

ابتدائیہ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم۔ نحمدہ تبارك وتعالیٰ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ وأصحابہ وأتباعہ أجمعین۔

اسلامی عقائد کے مطابق انسانی معاشرت کی بنیاد چند عقائد پر ہے:

یہ کائنات، زمین وآسمان، مخلوقات اور ہم سب اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوق ہیں۔ اس نے ہمیں پیدا کیا ہے، صلاحیتوں اور استعدادات سے نوازا ہے، زندگی کے اسباب فراہم کیے ہیں، پورے نظام کو چلا رہا ہے، کائنات کی ہر چیز اس کے علم، قدرت اور کنٹرول میں ہے اور اس کی بقا وفنا اسی کے قبضہ واختیار میں ہے۔ وغیر ذلک۔

وہ اپنی ذات، صفات، اختیارات اور افعال میں وحدہ لاشریک ہے، اس کے کسی معاملہ میں کوئی دخیل اور شریک نہیں ہے اور نہ ہی اس کی مرضی اور حکم کے بغیر کوئی کام ہوسکتا ہے۔

اس نے زمین وآسمان اور کائنات کے اس نظام کو بے مقصد پیدا نہیں کیا بلکہ ایک مقصد اور ایجنڈے کے مطابق اس نے مخلوقات کے اس نظام کو بنایا ہے اور اسی کے مطابق وہ اسے چلا رہا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْن۔ (الدخان ۳۸)

''اور ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے کھیل کے لیے نہیں بنایا۔''

اس کی مخلوقات میں انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے، کرّہ ارضی کا نظام تکوینی طور پر انسان کے حوالہ کیا گیا ہے، وہی اللہ تعالیٰ کے حکم اور مرضی کے مطابق زمین اور اس کے اردگرد کے

ماحول میں تصرف کر رہا ہے، اس حوالہ سے اسے دیگر زمینی مخلوقات پر برتری حاصل ہے اور وہ زمین کے وسائل واسباب سے سب سے زیادہ استفادہ کر رہا ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے علم وعقل سے نوازا ہے اور دیگر مخلوقات پر برتری عطا کی ہے۔

زمین کے اسباب ووسائل کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدے کے لیے بنایا ہے اور انسان کو اپنی بندگی اور اطاعت کے لیے مخصوص کیا ہے، عبادات اور اطاعت کے مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کرے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے، اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے اور اس کے احکام وقوانین کے مطابق زمین کا نظام چلائے۔

انسان اور جن کو اللہ رب العزت نے خواہش، رائے اور اختیار سے نوازا ہے اور یہ اس کی طرف سے آزمائش ہے کہ جنوں اور انسانوں کو اطاعت اور نافرمانی دونوں میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، البتہ اطاعت پر جنت اور نافرمانی پر جہنم کا نتیجہ بھی بتا دیا ہے۔

انسان کے لیے دنیا کی زندگی آزمائش اور امتحان ہے جس کے نتائج کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا اور اسی کے مطابق انسان کی آئندہ کی ابدی زندگی کا جنت یا جہنم کی شکل میں تعین ہوگا۔

دنیا میں انسان کو ضروریات کے مطابق اسباب فراہم کیے گئے ہیں، یہاں خواہشات کی تکمیل ممکن نہیں ہے، خواہشات کی تکمیل کے لیے جنت بنائی گئی ہے۔ جو وہاں تک پہنچ گیا اسے خواہشات کی تکمیل کے پورے مواقع میسر ہوں گے۔

دنیا میں انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہے اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے پر وہ کامیاب قرار پائے گا۔ وغیر ذلک۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جنت سے زمین پر اتارا ہے اور دنیاوی زندگی میں خدائی احکام کی پیروی پر جنت میں واپس لے جانے کا وعدہ فرمایا ہے، اور یہ فرمایا ہے کہ دنیاوی زندگی میں انسان اپنا مقصد زندگی اور پروگرام طے کرنے میں آزاد نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کا پابند ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا، فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوْا بِاٰيَاتِنَآ اُولٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ. (البقرہ ۳۸۔۳۹)

''ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے نیچے اتر جاؤ، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے، پس جو میری ہدایت پر چلیں گے ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو انکار کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہی دوزخی ہوں گے جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

یہ فرمایا ہے کہ دنیا پر انسان کی زندگی اور اس کے لیے اسباب عارضی ہیں:

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔ (الاعراف ۲۴)

''اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے، اور ایک وقت تک نفع اٹھانا ہے۔''

یہ فرمایا ہے کہ انسانوں کی ہدایت اور ان تک اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین پہنچانے کے لیے نبی اور رسول آئیں گے، انسانوں پر ان کی اطاعت ضروری ہوگی اور ان کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت شمار ہوگی۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (الاعراف ۳۵)

''اے آدم کی اولاد! اگر تم میں سے تمہارے پاس رسول آئیں جو تمہیں میری آیتیں سنائیں پھر جو شخص ڈرے گا اور اصلاح کرے گا ایسوں پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غم کھائیں گے۔''

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۔ (آل عمران ۳۲)

''کہہ دو اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔''

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَا اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا۔ (النساء ۸۰)

''جس نے رسول کا حکم مانا اس نے اللہ کا حکم مانا اور جس نے منہ موڑا تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔''

یہ فرمایا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی عارضی اور امتحانی ہے اور اصل زندگی آخرت کی ہے جہاں انسان هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ کی صورت میں جہاں رہیں گے، ہمیشہ رہیں گے۔

یہ فرمایا ہے کہ آسمانی تعلیمات سے انحراف کر کے بسر کی جانے والی زندگی خواہش اور گمان کی پیروی شمار ہوگی جبکہ حق بات صرف وہی ہے جو وحی کی شکل میں نازل ہوئی ہے:

اِن یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَ هُم مِّن رَّبِهِمُ الْهُدٰى۔ (النجم ۲۳)

''وہ محض وہم اور اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کے ہاں سے ہدایت آ چکی ہے۔''

یہ فرمایا ہے کہ سب انسانوں کی فطرت ایک ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید کے اقرار اور اس کی اطاعت و بندگی ہے۔ انسانی سوسائٹی میں خواہشات کے باعث اختلافات پیدا ہوئے جن میں انسانوں کی راہ نمائی کے لیے انبیاء کرامؑ اور رسول بھیجے گئے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ، فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ، وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ، وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ، فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ، وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. (البقرہ ۲۱۳)

''سب لوگ ایک دین پر تھے، پھر اللہ نے انبیاءؑ خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بھیجے، اور ان کے ساتھ سچی کتاب نازل کیں تاکہ لوگوں میں اس بات میں فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، اور اس میں اختلاف نہیں کیا مگر انہی لوگوں نے جنہیں وہ (کتاب) دی گئی تھی، اس کے بعد کہ ان کے پاس روشن دلیلیں آ چکی تھیں، آپس کی ضد کی وجہ سے، پھر اللہ نے اپنے حکم سے ہدایت کی ان کو جو ایمان والے ہیں اس حق بات کی جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے، اور اللہ جسے چاہے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔''

قرآن کریم نے یہ بات واضح کی ہے کہ انسان کو چند چیزیں وہبی طور پر عطا کی گئی ہیں اور ان کے استعمال اور ان میں ارتقاء اور کمال کے لیے اسے عقل کی نعمت سے نوازا گیا ہے۔ مثلاً:

علم وہبی ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (البقرہ ۳۱)

''اور اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے پھر ان سب چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔''

حیا وہبی ہے:

فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ ، فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ..... (الاعراف ۲۲)

''پھر انہیں دھوکے سے مائل کر لیا، پھر جب ان دونوں نے درخت کو چکھا تو ان پر ان کی شرم گاہیں کھل گئیں اور اپنے اوپر بہشت کے پتے جوڑنے لگے.....''

حکم و قانون وہبی ہے کہ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل میں جو جھگڑا ہوا اس کی بنیاد ایک حکم و ضابطہ کی پابندی یا خلاف ورزی پر تھی۔

مکان و سکونت کا شعور وہبی ہے کہ زمین پر پہلا گھر آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ (آل عمران ۹۶)

''بے شک لوگوں کے واسطے جو سب سے پہلا گھر مقرر ہوا یہی ہے جو مکہ میں برکت والا ہے اور جہان کے لوگوں کے لیے راہ نما ہے۔''

جدید فلسفہ کا تاریخی پس منظر

آج کا فلسفہ یہ کہتا ہے کہ انسان نے معاشرت کے اسباب اور بنیادیں عقل کی وجہ سے ارتقاء کے عمل کے نتیجے میں حاصل کی ہیں جبکہ اسلام کہتا ہے کہ معاشرت کی بنیادیں وہبی ہیں البتہ اس

میں ارتقاء اور ان کا بہتر سے بہتر استعمال کسبی ہے جس کا ذریعہ عقل و تجربہ ہے، اس طرح انسانی معاشرت کے اصول اور قواعد وضوابط طے کرنے میں وحی کو بنیاد کا درجہ حاصل ہے اور عقل اس کی معاون ہے۔ چنانچہ وحی اور عقل کے درمیان یہی متوازن رشتہ اور تعلق ہے، اس لیے عقل اگر وحی کے تابع رہے تو وہ اس کی بہترین معاون اور مددگار ہے لیکن اگر وحی کی پابندی کے بغیر اسے کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ انسان کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ جیسے ایک طاقت ور اور منہ زور گھوڑے کی لگام کھلی چھوڑ دی جائے تو گھوڑے کی وہی قوت اس کے سوار کے لیے ہلاکت کا باعث بن سکتی ہے۔

وحی اور عقل

قرآن کریم نے وحی کے تابع عقل کی تعریف کی ہے اور اسے نعمت خداوندی قرار دیتے ہوئے اس کے مسلسل استعمال کی تلقین فرمائی ہے مگر وحی کی پابندی سے آزاد عقل کو محض ظن قرار دیا ہے اور ظن وہویٰ کے جوڑ کو انسان کی تباہی، ناکامی اور بربادی کا سبب بتایا ہے، وحی انسان کی راہنما ہے اور عقل ایک بہترین آلہ ہے جسے استعمال کر کے انسان بہتر سے بہتر نتائج حاصل کرسکتا ہے۔ جس طرح کمپیوٹر ایک بہترین آلہ ہے مگر وہ کام اس پروگرام کے تحت ہی کرے گا جو اس میں فیڈ کیا جائے گا، اس کے بغیر وہ کسی کام کا نہیں ہے۔ عقل کے کمپیوٹر میں اگر آسمانی تعلیمات کا پروگرام فیڈ کر دیا جائے گا تو وہ اس کے مطابق کام کرے گا، لیکن اگر اس میں انسانی خواہشات اور ماحول کے اثرات و کیفیات کے وائرس کے لیے جگہ چھوڑ دی جائے گی تو وہ عقل کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کریں گی۔

انسان سلیم الفطرت

اسلام نے ہر پیدا ہونے والے بچے کو سلیم الفطرت قرار دیا ہے، اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کے کمپیوٹر میں پہلے سے کوئی پروگرام فیڈ نہیں ہے اور اس میں ہر پروگرام قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے، اسے جو ماحول ملتا ہے وہی اس کے کمپیوٹر میں فیڈ ہو جاتا ہے اور اس کی صلاحیتیں اور نفسیات اسی کے مطابق ڈھلتی اور استعمال ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسی لیے ہر علاقے اور

قوم کے لوگوں کی نفسیات اور ذہنی سطح دوسرے علاقوں کے لوگوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اسی طرح اجتماعی عقل اور عقل عام یا عقل مشترک (کامن سینس) بھی اپنے دور کے ماحول، مشاہدات، تجربات اور میسر معلومات سے تشکیل پاتی ہے اور ان امور میں تغیر وتبدل کے ساتھ بدلتی رہتی ہے جبکہ ماحول، مشاہدات، تجربات اور معلومات نہ زمانے کے لحاظ سے یکساں رہتے ہیں اور نہ ہی علاقہ کے اعتبار سے یکساں ہوتے ہیں۔ اس لیے فرد کی عقل کی طرح سوسائٹی کی عقل بھی کبھی ایک معیار پر اور ایک دائرے میں نہیں رہی اور ان مذکورہ امور میں مسلسل ارتقاء کے باعث آئندہ بھی اس کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔

یقین کا ذریعہ صرف وحی

اس لیے عقل کے ذریعہ حاصل ہونے والے علمی وفکری نتائج کو کبھی حتمی اور یقینی درجہ حاصل نہیں ہوسکتا اور عقل کا آخری درجہ ''ظن غالب' ہے، یقین کا درجہ صرف اور صرف وحی سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ عقل اگر وحی کے دائرے میں استعمال ہوتی ہے تو وہ نعمت خداوندی ہے اور انسان کا سب سے کامیاب ہتھیار ہے لیکن اگر یہ عقل انسانی خواہشات کے ہتھے چڑھ جائے تو بہت بڑا فتنہ اور عذاب ہے جو انسانی سوسائٹی کو شر وفساد سے بھر دیتی ہے، اسی وجہ سے اسلام نے انسانی معاشرت کے اصول اور اقدار وروایات کے یقین میں وحی اور آسمانی تعلیمات کو بنیاد قرار دیا ہے اور انسانی عقل کو خواہ وہ فرد کی ہو یا سوسائٹی کی، ایک اچھے معاون اور مددگار کی حیثیت دی ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی معاشرت، تمدن اور تہذیب وثقافت کو بہتر سے بہتر شکل دے سکتا ہے اور دنیا و آخرت کی دونوں زندگیوں کے لیے خوشیوں اور راحتوں کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔

انسانی معاشرہ اور تمدن انسان کے چند امتیازات پر مبنی ہے جو اسے دوسرے حیوانات سے الگ کرتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے لکھا ہے کہ کھانے، پینے، جنسی تعلق، گرمی سردی سے بچاؤ اور دشمن سے اپنے تحفظ وغیرہ کی حد تک انسان باقی حیوانات کے ساتھ شریک ہے لیکن انسان کے کچھ امتیازات ہیں جو اسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتے ہیں اور انہی پر تمدن کی بنیاد ہے۔

نسل انسانی کا نوعی امتیاز

☆ ایک یہ ہے کہ انسانی زندگی میں ٹھہراؤ نہیں ہے بلکہ آگے بڑھتے رہنے اور بہتر سے بہتر کیفیت حاصل کرنے کا جذبہ اس میں موجود ہے، مثلاً شیر کی خوراک گوشت ہے اور وہ اسے ہمیشہ ایک ہی طریقہ سے حاصل کرتا ہے اور ایک ہی طریقہ سے استعمال کرتا آرہا ہے، یہی گوشت انسانی خوراک کا حصہ ہے لیکن گوشت کے بہتر سے بہتر استعمال کے لیے انسان نے سینکڑوں صورتیں اختیار کر رکھی ہیں اور ان میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔

☆ سردی گرمی اور بارش دھوپ سے بچاؤ کم وبیش سبھی جانوروں کی ضرورت ہے لیکن باقی جانوروں کے پاس اس کا جو طریقہ صدیوں پہلے تھا، آج بھی وہی ہے اور ان کے اپنے اختیار سے اس طریقہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، مگر انسان نے اس کے سینکڑوں طریقے اختیار کیے ہیں اور مکانات، بلڈنگوں اور کوٹھیوں وغیرہ کی نئی سے نئی شکلیں اور اپنی رہائش گاہوں کو صاف رکھنے اور گرم اور ٹھنڈا کرنے کی بیسیوں صورتیں اس کے تجربات کا حصہ ہیں۔

☆ جنسی خواہش کی تکمیل اور نسل کے ارتقاء میں بھی انسان باقی حیوانات کے ساتھ شریک ہے لیکن باقی جانوروں کو اس مقصد کے لیے صرف ایک مادہ ساتھی درکار ہے جبکہ انسان کی ضرورت صرف یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ شادی اور خاندان کی تشکیل کے لیے اس نے اپنی ضروریات میں تنوع اور وسعت کو جس انتہا تک پہنچا دیا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

☆ مسابقت کا جذبہ بھی انسان کو دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتا ہے، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش اور اس کے لیے تگ و دو انسانی معاشرت اور تمدن میں ارتقاء کا بہت بڑا سبب ہے۔

☆ انسانی معاشرہ میں مفکرین، دانش وروں اور سائنس دانوں کی صورت میں ہر دور میں

ایسے افراد موجود رہے ہیں جو انسان کو سہولتیں فراہم کرنے، اس کی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے اور اسے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی صورتیں سوچتے رہتے ہیں، تجربات کرتے رہتے ہیں اور اس کے نتیجے میں نئی سے نئی سہولتوں سے انسانی معاشرہ کو روشناس کرتے رہتے ہیں۔

☆ سلیم الفطرت انسان کی سوچ اور محنت کا دائرہ صرف اس دنیا کی زندگی تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اپنی آئندہ اور اصل زندگی کو ہر وقت سامنے رکھتا ہے اور دنیا کی زندگی کو آخرت کی ابدی زندگی کے لیے ذریعہ اور سبب بنانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔

انسان مدنی الطبع ہے

انسانی معاشرت باہمی تعاون واشتراک اور ایک دوسرے کے حقوق پر مبنی ہے کیونکہ کوئی بھی انسان اپنی ساری ضروریات تنہا پوری کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، کچھ لوگ خوراک کی ضروریات مہیا کرنے میں مصروف رہتے ہیں، کچھ لوگ لباس کی ضروریات کی فراہمی میں مشغول ہیں، کچھ حضرات مکانات وغیرہ کی تیاری کا کام کرتے ہیں، کچھ لوگ انسانی زندگی کی باقی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنے دائرہ میں محنت کر رہے ہیں اور بہت سے لوگ ان تیار شدہ اشیاء کو مارکیٹ میں لا کر تجارت کی صورت میں لوگوں تک پہنچانے کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

زراعت، تجارت، مال مویشی پالنا، صنعت وحرفت، ملازمت، مزدوری، فوجی خدمات، قیام امن کی خدمات اور دیگر بیسیوں شعبے انسانی معاشرہ کی ضروریات ہیں جن میں الگ الگ طور پر لاکھوں نہیں کروڑوں انسان کام کر رہے ہیں جو ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی سے تمدن اور شہریت وجود میں آتی ہے، اس باہمی تعاون واشتراک کو ضروریات کے دائرے میں محدود رکھنے اور تنازعات واختلافات سے بچانے یا جھگڑے فساد کی صورت میں انصاف فراہم کرنے اور امن قائم کرنے کے لیے باہمی حقوق و فرائض اور قواعد وضوابط کا تعین ضروری ہے کیونکہ ایک دوسرے کے حقوق صحیح طریقہ سے ادا کیے جائیں گے تو باہمی تعاون واشتراک سے صحیح فائدہ اٹھایا جا سکے گا، اپنے اپنے فرائض پورے طریقہ

سے ادا کیے جائیں گے تو معاشرہ امن اور خوشحالی کا گہوارہ بنے گا اور حقوق و فرائض کے صحیح تعین اور ادائیگی کے لیے قواعد و ضوابط ضروری ہیں۔ اس لیے اسلام نے ایک سوسائٹی میں رہنے والے انسانوں کے باہمی حقوق کا تعین بھی کیا ہے اور فرائض کی نشاندہی بھی کی ہے اور فرائض و حقوق کی ادائیگی پر یکساں زور دیا ہے۔ آج کا عالمی فلسفہ بھی حقوق کی بات کرتا ہے اور اسلام نے بھی حقوق کی بات کی ہے لیکن ان دونوں میں دو اصولی باتوں کا فرق ہے جس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

حقوق کا اسلامی فلسفہ

☆ اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی بات کرتا ہے مگر آج کا عالمی فلسفہ صرف انسانی حقوق کی بات کرتا ہے اور حقوق اللہ پر سرے سے بحث ہی نہیں کرتا جبکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ جس خدا نے تمہیں پیدا کیا ہے اور روزی دے رہا ہے اس کے بھی تم پر حقوق ہیں اور جن انسانوں کے ساتھ تم دنیا میں اکٹھے رہتے ہو ان کے بھی تم پر حقوق ہیں۔

☆ آج کا عالمی فلسفہ اس دنیا کی عارضی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتے ہوئے صرف اس کے دائرے میں حقوق کا نظام طے کرتا ہے مگر اسلام موت کے بعد کی زندگی کو انسان کی اصل زندگی قرار دے کر دونوں زندگیوں کو سامنے رکھتے ہوئے حقوق و فرائض کا تعین کرتا ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو بنیاد بناتے ہوئے سابقہ آسمانی تعلیمات میں حقوق کی تعلیم دی گئی تھی اور قرآن کریم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے ان کا اعادہ کیا ہے۔ چنانچہ بائبل کی کتاب خروج باب ۲۰ آیات ۱ تا ۱۷ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور سے اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات لے کر قوم کے پاس آئے تو بنی اسرائیل کے سامنے یہ خطبہ ارشاد فرمایا کہ:

''اور خداوند نے یہ سب باتیں فرمائیں کہ o خداوند تیرا خدا جو تجھے ملک مصر سے اور غلامی کے گھر سے نکال لایا میں ہوں o میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا o تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی صورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے o تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ ان کی عبادت کرنا کیونکہ میرا خداوند تیرا خدا غیور ہے اور جو مجھ سے عداوت رکھتے ہیں ان کی اولاد کو تیسری

پشت اور چوتھی پشت تک باپ دادا کی بدکاری کی سزا دیتا ہوں o اور ہزاروں پر جو مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور میرے حکموں کو مانتے ہیں رحم کرتا ہوں o تو خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ نہ لینا کیونکہ جو اس کا نام بے فائدہ لیتا ہے خداوند اسے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا o یاد کر کے تو سبت کا دن پاک منانا o چھ دن تک تو محنت کر کے اپنا سارا کام کاج کرنا o لیکن ساتویں دن جو خداوند تیرا خدا کا سبت ہے اس میں نہ تو کوئی کام کرے نہ تیرا بیٹا نہ تیری بیٹی نہ تیرا غلام نہ تیری لونڈی نہ تیرا چوپایہ نہ کوئی مسافر جو تیرے ہاں تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو o کیونکہ خداوند نے چھ دن میں آسمان اور زمین اور سمندر اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب بنایا اور ساتویں دن آرام کیا اس لیے خداوند نے سبت کے دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا o تو اپنے ماں باپ کی عزت کرنا تا کہ تیری عمر اس ملک میں جو خداوند تیرا تجھے دیتا ہے دراز ہو o تو خون نہ کرنا o تو زنا نہ کرنا o تو چوری نہ کرنا o تو اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا o تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ نہ کرنا o تو اپنے پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا اور نہ اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے کا اور نہ اپنے پڑوسی کی کسی اور چیز کا لالچ کرنا۔''

توراۃ کی یہ تعلیمات اسلام نے بھی اسی طرح بیان کی ہیں، صرف اس فرق کے ساتھ کہ ہمارے ہاں ہفتے کا مقدس دن ہفتہ کی بجائے جمعہ ہے اور کام کاج سے ممانعت کا دورانیہ پورے دن کی بجائے جمعہ کی اذان سے نماز کے اختتام تک محدود ہو گیا ہے جبکہ ''خداوند نے ساتویں دن آرام کیا'' کا مطلب ہمارے ہاں یہ ہوگا کہ اگر یہ ترتیب اسی طرح ہے تو ساتویں دن اللہ تعالیٰ نے تخلیق ارض وسماء کے حوالے سے کوئی کام نہیں کیا۔ بائبل کی ان آیات کو سامنے رکھ کر اگر قرآن کریم کی سورۃ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع کا مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالہ سے قرآن کریم اور تورات کی تعلیمات کس حد تک مشترک اور ملتی جلتی ہیں۔

قرآن کریم میں ''حق'' کا لفظ مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے:

اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسماء گرامی میں ایک اسم مبارک ''الحق'' ہے۔ اس آیت میں حق کو باطل

کے مقابلہ میں بیان کیا گیا ہے:

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔(الاسراء۸۱)

''اور کہہ دو کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا ہے، بے شک باطل مٹنے ہی والا تھا۔''

اس آیت میں قیامت کو حق کا عنوان دیا گیا ہے:

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَق فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَئَابًا۔(النباء۳۹)

''یہ یقینی دن ہے پس جو چاہے اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنالے۔''

اس آیت میں حق کو باہمی حقوق کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہے، وغیر ذلک۔

وَاٰتِ ذَى الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۔ (الاسراء ۲۶)

''اور رشتہ دار اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دے دو اور مال کو بے جا خرچ نہ کرو۔''

حقوق: قرآن وحدیث میں

باہمی حقوق کا تذکرہ قرآن کریم اور احادیث میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے، مثال کے طور پر ایک آیت کریمہ اور ایک حدیث نبویؐ کا حوالہ دیا جارہا ہے:

قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔(النساء ۳۶)

''اور اللہ کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریبی ہمسایہ، اجنبی ہمسایہ، پاس بیٹھنے والے، مسافر اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ بھی نیکی کرو، بے شک اللہ اترانے والے، بڑائی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے حق کے بعد انسانوں میں سے نو قسم کے لوگوں کا حق بیان کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ ان حقوق کی مزید وضاحت کے لیے سورۃ الانعام کی آیات **قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُم** ..... (الانعام ۱۵۱) اور سورۃ بنی اسرائیل کا رکوع ۳ اور ۴ کا مطالعہ کر لیا جائے۔

جبکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد گرامی کی تفصیل بخاری شریف میں یوں ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ جب یہودی خاندان کی غلامی سے آزادی حاصل کر کے جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں مہاجر کے طور پر حاضر ہوئے تو نبی اکرمؐ نے انہیں ''مواخاۃ'' کے تحت حضرت ابوالدرداءؓ کا بھائی بنا دیا اور وہ انہیں اپنے گھر لے گئے۔ دوسرے روز انہوں نے فجر کے بعد جناب نبی اکرمؐ کو یہ رپورٹ پیش کی کہ حضرت سلمانؓ نے کل دوپہر کو مہمان کے ساتھ کھانے کے لیے ان کا روزہ تڑوا دیا اور ساری رات نوافل پڑھنے کا موقع نہیں دیا بلکہ زبردستی سونے کا کہہ کر سحری کے وقت نفل پڑھنے دیئے اور اب یہ نصیحت کر کے ساتھ لائے ہیں کہ:

ان لربک علیک حقًا ولنفسک علیک حقًا ولزوجک علیک حقًا فاعط کل ذی حق حقه. (بخاری شریف)

''بے شک تیرے رب کا تجھ پر حق ہے، تیری جان کا تجھ پر حق ہے، تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے اور پس ہر حق والے کو اس کا حق ادا کر۔''

جناب نبی اکرمؐ نے یہ سن کر فرمایا کہ **صدق سلمان** اور حضرت سلمان فارسیؓ کے اس عمل اور قول کی تصدیق فرما دی۔ اس کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی شادی کے بعد ان کے ساتھ جناب نبی اکرمؐ کی تفصیلی گفتگو کو ملاحظہ کر لیا جائے جو امام بخاریؒ نے مختلف مقامات پر بیان فرمائی ہے اور ان صحابہ کرامؓ کو جناب نبی اکرمؐ کی طرف سے کی جانے والی تنبیہ بھی شامل کر لی جائے جنہوں نے آپس میں ساری عمر شادی نہ کرنے اور زندگی بھر روزے رکھنے اور ساری ساری رات عبادت کرنے کا وعدہ کر لیا تھا اور نبی اکرمؐ نے **النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی** فرما کر انہیں ایسا کرنے سے منع فرما دیا تھا۔

میری طالب علمانہ رائے میں قرآن کریم کی مذکورہ آیات مبارکہ اور جناب نبی اکرمؐ کے یہ

ارشادات مقدسہ اسلام میں انسانی حقوق کی اساس ہیں اور ان کے ساتھ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں اس حوالہ سے پھیلے ہوئے متنوع ذخیرہ کے ذریعہ انسانی حقوق کا ایک مکمل اور مبوّب نظام مرتب کیا جا سکتا ہے۔

حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور آج کے عالمی فلسفہ کے درمیان دو اصولی فرق سطور بالا میں مذکور ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی بات کرتا ہے جبکہ مغربی فلسفہ صرف حقوق العباد پر بحث کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ اسلام دنیا کی زندگی کے ساتھ آخرت کی زندگی کو سامنے رکھ کر حقوق کا تعین کرتا ہے جبکہ مغربی فلسفہ دنیاوی زندگی کو ہی حتمی اور آخری سمجھ کر اس کے دائرہ میں حقوق کی بات کرتا ہے۔

اسلام اور مغربی تہذیب میں فرق

اس کے علاوہ ان دونوں کے مابین تین فرق اور بھی ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

☆ ایک یہ کہ آج کا عالمی فلسفہ چونکہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی سے منحرف ہو کر اس سے معاشرتی زندگی میں مکمل دست برداری اختیار کر چکا ہے، اس لیے اس کے نزدیک حقوق کا تعین اور ان کی وضاحت سوسائٹی کی سوچ اور خواہش کی بنیاد پر ہوتی ہے جبکہ اسلام میں حقوق کے تعین کی بنیاد وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر ہے اور جو حقوق وحی الٰہی میں طے ہو چکے ہیں ان میں رد و بدل کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس کے برعکس مغربی فلسفہ میں حقوق کے تعین کی بنیاد سوسائٹی کی سوچ اور خواہش پر ہے اس لیے حقوق کی فہرست میں رد و بدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً ہم جنس پرستی کو بائبل نے گناہ قرار دیا ہے اور اس پر سنگسار کر دینے کی سزا بیان کی ہے اور مغربی ممالک میں اب سے ایک صدی قبل تک اسے جرائم کی فہرست میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن سوسائٹی کی خواہش اور سوچ میں تبدیلی ہو جانے کے باعث اب اسے جرائم کی فہرست سے نکال کر حقوق کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح آسمانی مذاہب اور انبیاء کرام علیہم السلام کی توہین اس سے قبل جرائم میں شمار ہوتی تھی مگر اب اس کا حوالہ حقوق کے عنوان سے سامنے آ رہا ہے اور شراب نوشی اب

سے پون صدی قبل خود امریکہ کے قانون میں قابل سزا جرم تھی مگر اب وہ بھی حقوق کا حصہ بن گئی ہے۔

☆ دوسرا فرق یہ ہے کہ مغربی دنیا میں عوامی حقوق کا دور انقلاب فرانس سے شروع ہوتا ہے، اس سے قبل کے دور کو جبر، تاریکی اور جہالت کا دور تصور کیا جاتا ہے، انقلاب فرانس اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری عشرہ میں مکمل ہوا تھا، اس لحاظ سے مغربی دنیا میں حقوق کی تاریخ کم وبیش سوا دو صدیوں پر مشتمل ہے جبکہ اسلام میں جناب نبی اکرمؐ سے قبل کے دور کو ''دور جاہلیت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور روشن خیالی، علم اور حقوق کا دور جناب نبی اکرمؐ سے شروع ہوتا ہے اور اس کی تاریخ سوا چودہ سو سال کو محیط نظر آتی ہے، بلکہ اگر بنی اسرائیل کے اس دور کو ساتھ شامل کر لیا جائے جب تورات عملاً نافذ تھی اور اس کے مطابق بنی اسرائیل کا معاشرتی نظام چل رہا تھا تو انسانی حقوق کی تاریخ کا یہ پس منظر ہزاروں سال پر محیط ہو جاتا ہے۔

☆ تیسرا فرق اسلامی تعلیمات اور حقوق کے مغربی فلسفہ میں یہ ہے کہ اسلام حقوق طلب کرنے کی بجائے حقوق ادا کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے جبکہ مغربی فلسفہ کی زیادہ توجہ حقوق حاصل کرنے کی تلقین پر ہوتی ہے۔ ان دونوں رویّوں کے معاشرتی اثرات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر میں انسانی حقوق کے اس عالمگیر منشور اور اعلامیہ کا جائزہ لینا ضروری ہے جو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو منظور کیا تھا اور جسے دنیا بھر میں انسانی حقوق بلکہ پورے معاشرتی نظام کے لیے مشترکہ معیار قرار دیا جاتا ہے۔

جن ممالک نے اس منشور پر دستخط کیے ہیں اور جو اقوام متحدہ کے نظام میں شریک ہیں ان سے اقوام متحدہ کے مختلف اداروں، مغربی ممالک کی حکومتوں، انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیموں اور اس مقصد کے لیے کام کرنے والی این جی اوز کا مسلسل یہ مطالبہ رہتا ہے کہ وہ انسانی حقوق کے اس عالمی چارٹر کی پابندی کریں، اپنے ملک کے نظام وقوانین کو اس کے دائرہ میں لائیں اور اگر اس کے کسی ضابطے کے خلاف کسی ملک میں کوئی قانون یا ضابطہ موجود ہے تو اسے تبدیل کیا جائے تاکہ

پوری دنیا میں انسانی حقوق کی یکساں پاسداری ہو اور ایک جیسا معاشرتی ماحول پیدا کیا جا سکے۔

انسانی حقوق اور اقوام متحدہ

انسانی حقوق پر عمل کی نگرانی کے لیے اقوام متحدہ کا ایک مستقل ادارہ ''انسانی حقوق کمیشن'' کے نام سے قائم ہے جس کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں ہے، یہ پوری دنیا میں اس حوالہ سے مسلسل جائزہ لیتا رہتا ہے اور ہر ملک کے بارے میں سالانہ رپورٹ جاری کرتا ہے کہ وہاں انسانی حقوق کے چارٹر کی کون کون سی شق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، یہ کمیشن انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی شکایات سنتا ہے اور ان کی انکوائری کر کے متعلقہ ملک کے خلاف رپورٹ جاری کرتا ہے جس کی بنیاد پر اس ملک کے بارے میں عالمی ادارے اور حکومتیں اپنی پالیسیوں اور طرز عمل کا تعین کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کے علاوہ یورپی یونین، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور امریکی وزارت خارجہ کی طرف سے بھی اس قسم کی سالانہ رپورٹیں جاری ہوتی ہیں اور متعلقہ حکومتوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملکوں میں انسانی حقوق کی مبینہ خلاف ورزیوں کو روکیں اور ان سے متصادم قوانین کو منسوخ کریں یا ان میں ترامیم کر کے انہیں اس کے مطابق بنائیں۔

اسلامی قوانین پر اعتراضات

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی دستوری دفعات، توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کے قانون، حدود آرڈیننس، قصاص و دیت کے قوانین اور شریعت اسلامیہ کے حوالہ سے نافذ دیگر قوانین کے خلاف عالمی پروپیگنڈے اور عالمی اداروں و حکومتوں کے دباؤ کا پس منظر یہی ہے اور اس کے دو پہلو ہیں:

☆ ایک یہ ہے کہ پاکستان کی بنیاد اسلام کے نفاذ اور اسلامی معاشرت کے قیام پر ہے جس کی وضاحت قرارداد مقاصد اور متعدد دستوری دفعات میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ پاکستان کا یہ نظریاتی اسلامی تشخص بجائے خود عالمی حلقوں کے نزدیک قابل اعتراض ہے کیونکہ آج کے عالمی فلسفہ اور خاص طور پر مغربی حکومتوں کا موقف یہ ہے کہ ریاست اور حکومت کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے اور ریاستی قوانین و نظام

کو مذہب کی کسی بھی پابندی سے آزاد ہونا چاہیے، ان کے نزدیک کوئی بھی حکومت جو مذہب کی بنیاد پر اپنا نظام چلائے یا ریاستی پالیسیوں میں مذہبی احکام وقوانین کو دخیل کرے ایک معیاری حکومت نہیں ہے اور ان کے خیال میں اسے اپنی پالیسی ترک کر کے ریاستی اور حکومتی معاملات میں مذہب کی پابندی سے آزاد ہو جانا چاہیے اور اس کے لیے ان کی طرف سے مسلسل دباؤ موجود ہے جو بڑھتا جا رہا ہے۔

☆ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کے نزدیک اسلام کے بہت سے معاشرتی احکام وقوانین انسانی حقوق کے اس عالمی منشور سے متصادم ہیں جن کا نفاذ ان کے خیال میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے اور چونکہ پاکستان نے اقوام متحدہ کے اس چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں اور وہ اقوام متحدہ کے نظام کا حصہ ہے اس لیے پاکستان میں نافذ ان کے بقول انسانی حقوق کے منافی قوانین کو تبدیل کرنا اس بین الاقوامی معاہدہ اور منشور کا لازمی تقاضہ ہے۔

اس بنا پر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں اس امر کی نشاندہی کی کوشش کی جائے گی کہ اسلامی شریعت کے کون کون سے احکام وقوانین آج کی دنیا میں انسانی حقوق کے منافی تصور کیے جا رہے ہیں اور اسلامی دنیا سے ان احکام و قوانین سے دست بردار ہونے کو کہا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ اسلامی دنیا بالخصوص پاکستان کے علمی و دینی مراکز اس طرف سنجیدہ توجہ دیں گے اور اسلامی احکام وقوانین کی عالمی سطح پر وضاحت و دفاع کے لیے اپنا فرض بہتر انداز سے سرانجام دے سکیں گے۔

ابو عمار زاہد الراشدی ____ نزیل مدینہ منورہ

۲۹ شعبان ۱۴۳۳ھ / ۱۹ جولائی ۲۰۱۲ء

انسانی حقوق کا مغربی پس منظر

مغرب میں انسانی حقوق کے حوالہ سے جو تاریخ بیان کی جاتی ہے اس کا آغاز ''میگنا کارٹا'' سے کیا جاتا ہے۔ ۱۲۱۶ء میں برطانیہ کے کنگ جان اور جاگیرداروں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا معاہدہ اس عنوان سے ہوا تھا کہ جس کا اصل مقصد تو بادشاہ اور جاگیرداروں کے مابین اختیارات اور حدود کار کی تقسیم تھا لیکن اس میں عام لوگوں کا بھی کسی حد تک تذکرہ موجود تھا، اس لیے اسے انسانی حقوق کا آغاز تصور قرار دیا جاتا ہے۔

مغربی ممالک میں ایک عرصہ تک حکمرانی کا حق اور اس کے تمام تر اختیارات تین طبقوں کے درمیان دائر رہے ہیں:

(۱) بادشاہ (۲) جاگیردار اور (۳) مذہبی قیادت

ان میں مختلف مراحل میں آپس میں کشمکش بھی رہی ہے لیکن عام شہری اس تکون کے درمیان جو دراصل جبر اور ظالمانہ حاکمیت کی تکون تھی صدیوں تک پستے رہے ہیں، مغرب خود اس دور کو جبر وظلم اور تاریکی وجاہلیت کا دور کہتا ہے اور اس تکون سے نجات حاصل کرنے کے لیے مغربی دنیا کے عوام کو طویل جدوجہد اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ بہرحال ان حکمران طبقات کی باہمی کشمکش کے پس منظر میں کنگ جان اور جاگیرداروں کے درمیان اختیارات کی باہمی تقسیم کے معاہدہ کو ''میگنا کارٹا'' کہا جاتا ہے اور مغربی دنیا اسے انسانی حقوق کی ابتدائی دستاویز قرار دیتی ہے جو ۱۲۱۶ء میں ۱۵ جون کو طے پایا تھا۔

اس کے بعد ۱۶۸۴ء میں عوامی بغاوت کے نتیجے میں انقلابی فوج نے پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ کا قانون پیش کیا اور ۱۶۸۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ''بل آف رائٹس'' (حقوق کے قانون)

کی منظوری دی جو اس سمت پیش رفت کا اہم مرحلہ تھا۔

ادھر امریکہ میں تھامس جیفرسن نے ۱۲ جولائی ۱۷۷۶ء کو برطانوی استعمار کے تسلط سے امریکہ کی مکمل آزادی کا اعلان کیا اور ۱۷۸۹ء میں امریکی کانگریس نے دستور میں ترامیم کے ذریعہ عوامی حقوق کو دستور کا حصہ بنایا۔

انقلابِ فرانس

فرانس میں زبردست عوامی جدوجہد اور بغاوت کے ذریعہ ۱۷۸۹ء کو جاگیرداری، بادشاہت اور ریاستی معاملات میں چرچ کی مداخلت کو مسترد کر کے قومی اسمبلی سے شہری حقوق کا قانون ''ڈیکلریشن آف رائٹس آف مین'' منظور کرایا اور پورے سیاسی اور معاشرتی نظام کی کایا پلٹ دی، اسے ''انقلابِ فرانس'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسے مغرب میں ظلم و جبر اور حقوق کے درمیان حد فاصل قرار دیا جاتا ہے، اسی انقلاب فرانس کے ذریعہ نہ صرف بادشاہت اور جاگیرداری کا مکمل خاتمہ ہوگیا بلکہ اقتدار میں مذہبی قیادت کی شرکت کی بھی نفی کر دی گئی جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ چرچ، پوپ اور مذہبی قیادت نے عوام پر بادشاہ اور جاگیرداروں کی طرف سے ہونے والے دوہرے مظالم اور شدید جبر و تشدد میں عوام کا ساتھ دینے کی بجائے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا تھا اور مذہب عملاً بادشاہت اور جاگیرداری کا پشت پناہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس لیے بادشاہ اور جاگیردار کے ساتھ ساتھ پوپ کی سیاسی قیادت کا بوریا بستر بھی لپیٹ دیا گیا تھا اور نئے نظام میں ہمیشہ کے لیے طے کر دیا گیا کہ مذہب اور چرچ کا تعلق انسان کے عقیدہ، عبادت اور اخلاقیات کے ساتھ رہے گا جبکہ سیاسی و معاشرتی معاملات میں رائے دینے، راہ نمائی کرنے اور مداخلت کرنے کا مذہب، پادری اور چرچ کو کوئی حق نہیں ہوگا، اسی کو آگے چل کر ''سیکولرازم'' سے تعبیر کیا گیا اور اسی کو معیاری نظام قرار دے کر پوری دنیا سے اسے اختیار کرنے اور اس کی پابندی کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرہ میں یورپی ممالک یعنی برطانیہ اور جرمنی وغیرہ کے درمیان جنگ ہوئی جس میں پوری دنیا بالواسطہ یا بلا واسطہ لپیٹ میں آ گئی، اس لیے اسے ''جنگ

عظیم اول'' کا نام دیا جاتا ہے، اس میں عالم اسلام کی نمائندہ حکومت ''خلافت عثمانیہ'' نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا اور جرمنی کے ساتھ ساتھ وہ بھی شکست سے دوچار ہوگئی تھی اور اسی کے نتیجے میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ بھی ہوگیا تھا۔ اس جنگ میں لاکھوں انسانوں کے قتل ہوجانے کے بعد اقوام و ممالک کی ایک بین الاقوامی تنظیم ''لیگ آف نیشنز'' قائم کی گئی تھی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اقوام وممالک کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کو جنگ کی صورت اختیار نہ کرنے دی جائے اور اس بین الاقوامی فورم کے ذریعہ ان تنازعات کا حل نکال کر قوموں اور ملکوں کی باہمی جنگ کو روکا جائے، لیکن ''لیگ آف نیشنز'' اپنے اس مقصد میں ناکام ہوگئی اور بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کے درمیان پھر عالمی جنگ بپا ہوئی جس میں جرمنی اور جاپان ایک طرف اور برطانیہ، فرانس اور روس وغیرہ دوسری طرف تھے۔ اس جنگ نے پہلی جنگ سے زیادہ تباہی مچائی اور اس کے آخری مراحل میں امریکہ نے اتحادیوں کی حمایت میں جنگ میں شریک ہوکر جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا جس پر جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا۔

اقوامِ متحدہ کا قیام

اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں ایک اور بین الاقوامی تنظیم ''یونائیٹڈ نیشنز'' (اقوام متحدہ) کے نام سے وجود میں آئی جو ابھی تک نہ صرف قائم ہے بلکہ بین الاقوامی معاملات کا کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اقوام متحدہ کے تنظیمی اور پالیسی سازی کے اختیارات اور معاملات پر اجاری داری کی وجہ سے اقوام متحدہ پر مغربی ممالک کی بالادستی قائم ہے اور اسے عام طور پر انہی کے حق میں استعمال کیا جارہا ہے۔

اقوام متحدہ کی تنظیمی صورت حال یہ ہے کہ اس کی ایک ''جنرل اسمبلی'' ہے جس میں تمام ممبر ممالک برابر کے رکن ہیں اور سال میں ایک بار تمام ممالک کے حکمران یا ان کے نمائندے جمع ہو کر عالمی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس کے نتیجے میں قراردادیں پاس ہوتی ہیں۔ لیکن ان قراردادوں کی حیثیت صرف سفارش کی ہوتی ہے، ان کا نفاذ ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

چنانچہ جنرل اسمبلی کی سینکڑوں سفارشی قراردادیں اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی فائلوں میں دبی پڑی ہیں۔

اقوام متحدہ میں پالیسی سازی، فیصلوں اور ان کے نفاذ کی اصل قوت ''سلامتی کونسل'' ہے جس کے گیارہ ارکان میں سے پانچ ارکان (۱) امریکہ (۲) برطانیہ (۳) فرانس (۴) روس اور (۵) چین مستقل ممبر کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ چھ ارکان دنیا کے مختلف ممالک میں سے باری باری دو دو سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ یہ گیارہ رکنی سلامتی کونسل اقوام متحدہ کی اصل قوت اور اتھارٹی ہے لیکن ان میں سے پانچ مستقل ارکان کو ویٹو پاور یعنی حق استرداد حاصل ہے کہ امریکہ، روس، چین، برطانیہ اور فرانس میں سے کوئی ایک ملک بھی سلامتی کونسل کے کسی فیصلے کو مسترد کر دے تو وہ کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس طرح پوری دنیا کے نظام پر اقوام متحدہ کے نام سے اصل حکمرانی اور کنٹرول ان پانچ ممالک کا ہے اور یہ پانچ ممالک جس بات پر متفق ہو جائیں پوری دنیا کو وہ فیصلہ بہر حال تسلیم کرنا ہوتا ہے۔

اقوام متحدہ کا اصل مقصد تو قوموں اور ملکوں کے درمیان ہونے والے تنازعات کا حل تلاش کرنا اور جنگ کو روکنا ہے، لیکن ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا عالمگیر چارٹر منظور کر کے اور اس کی پابندی کو تمام ممالک و اقوام کے لیے لازمی قرار دے کر دنیا کے سیاسی اور معاشرتی نظام میں راہ نمائی اور مداخلت کو بھی اپنے دائرہ کار میں شامل کر لیا اور اس کے بعد سے ممالک و اقوام کے درمیان جنگ کو روکنے کے ساتھ دنیا بھر کے ممالک کے سیاسی اور معاشرتی نظاموں کو کنٹرول کرنا بھی اقوام متحدہ کی ذمہ داری سمجھا جا رہا ہے اور اقوام متحدہ اس سلسلہ میں مسلسل کردار ادا کر رہی ہے۔

اقوامِ متحدہ کے اصل پالیسی ساز

کہا یہ جاتا ہے کہ اقوام متحدہ ایک بین الاقوامی تنظیم ہے اور اس کے تحت متفقہ طور پر یا اکثریت کے ساتھ طے ہونے والے فیصلے ''بین الاقوامی معاہدات'' کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن تاریخ اور معاشرت کے ایک طالب علم کے طور پر مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل

اپنے جن فیصلوں کو دنیا پر نافذ کرنا چاہتی ہے وہ عملاً نافذ ہوتے ہیں، ان کی خلاف ورزی کرنے والے ملکوں کو سزا دی جاتی ہے حتیٰ کہ خلاف ورزی کرنے والے ملکوں پر فوج کشی بھی کی جاتی ہے اور انہیں اقوام متحدہ کا فیصلہ تسلیم کرنے پر بزور مجبور کیا جاتا ہے، اس لیے انسانی حقوق کا چارٹر اور اقوام متحدہ کے دیگر فیصلے صرف ''معاہدات'' نہیں بلکہ عملاً ''بین الاقوامی قانون'' بن چکے ہیں اور خود اقوام متحدہ صرف بین الاقوامی تنظیم نہیں بلکہ عملاً ایک عالمی حکومت کا درجہ رکھتی ہے جس کے ذریعہ سلامتی کونسل میں ویٹو پاور رکھنے والے پانچ ممالک عملاً پوری دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے اس عملی کردار کو سامنے رکھنا بالخصوص عالم اسلام کے ان حلقوں کے لیے انتہائی ضروری ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ، اسلامی معاشرہ کے قیام اور خلافت اسلامیہ کے احیاء کے لیے دنیا کے کسی بھی حصہ میں محنت کر رہے ہیں تاکہ انہیں یہ معلوم ہو کہ اس سلسلہ میں ان کا مقابلہ اصل میں کس قوت سے ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ایسی جدوجہد کرنے والے حلقے اور طبقے اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ ہم اپنے ملک میں اپنے مقتدر حلقوں سے نفاذِ اسلام کا مطالبہ کر رہے ہیں یا ان سے نفاذِ اسلام کے لیے لڑ رہے ہیں جبکہ حقیقی صورت حال یہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے کسی بھی حصے میں نفاذِ اسلام یا شریعت کے قوانین کی ترویج کی جدوجہد ہو اس کا سامنا اصل میں ایک بین الاقوامی نظام سے ہے اور ایک مضبوط عالمی نیٹ ورک سے ہے جو ساری دنیا میں ''انسانی حقوق کے چارٹر'' کے عنوان سے مغرب کا طے کردہ سیاسی اور معاشرتی نظام نافذ کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہے۔

عالمِ اسلام کے تحفظات

عالم اسلام کے کم وبیش سبھی ممالک اقوام متحدہ کا حصہ ہیں اور اس کے معاملات میں شریک ہیں لیکن عالم اسلام کے نظریاتی اور باشعور حلقوں کو دو حوالوں سے واضح طور پر تحفظات کا سامنا ہے۔ ایک یہ کہ اقوام متحدہ کی فیصلہ سازی اور فیصلوں کے نفاذ کی اتھارٹی میں عالم اسلام کی کوئی نمائندگی نہیں ہے اور مسلمانوں کا کوئی ملک بھی ان پانچ ممالک میں شامل نہیں ہے جنہیں فیصلے مسترد کر دینے اور معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا اختیار اور حق حاصل ہے۔ اس طرح

اقوام متحدہ کے فیصلہ سازی اور فیصلوں کی تنفیذ کے معاملات سے عالم اسلام کلیتہً بے دخل ہے اور اس کا کردار دنیا کے ان پانچ بڑوں کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے اور کرتے چلے جانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہمارا دوسرا تحفظ انسانی حقوق کے چارٹر کے حوالہ سے ہے جو صرف مغربی ممالک کی باہمی کشمکش اور انقلاب فرانس کے پس منظر کو رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے اور اس کی بہت سی دفعات اسلامی شریعت کے احکام وقوانین سے متصادم ہیں اور عملی صورت حال یہ ہے جس کی ہم آئندہ سطور میں وضاحت کریں گے کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کو من وعن قبول کر لینے کی صورت میں مسلم ممالک اور حکومتوں کو قرآن وسنت کے بیسیوں احکام اور شریعت اسلامیہ کے سینکڑوں ضابطوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے جبکہ عالم اسلام کی صورت حال یہ ہے کہ مسلم ممالک کے حکمران طبقات خدانخواستہ اس کے لیے کسی درجہ میں تیار بھی ہوں مگر مسلم عوام کی اکثریت دنیا کے کسی بھی خطے میں اس کے لیے تیار نہیں ہے اور گزشتہ نصف صدی کے دوران درجنوں مسلم ممالک کی رائے عامہ جمہوری وسیاسی ذرائع سے بھی اس امر کا اظہار کر چکی ہے کہ قرآن وسنت کے احکام وقوانین اور ریاست وحکومت کے معاملات میں مذہب کے کردار سے دست بردار ہونے کے لیے وہ کسی صورت میں بھی تیار نہیں ہیں۔

اقوام متحدہ کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا کہ عالم اسلام کو اقوام متحدہ کے فیصلہ سازی اور فیصلوں کے نفاذ کے نظام میں شریک کیا جائے اور انسانی حقوق کے چارٹر پر نظر ثانی کی جائے۔ اگر اس وقت عالم اسلام کی دیگر حکومتیں بھی ان کا ساتھ دیتیں تو اس سلسلہ میں مؤثر پیش رفت ہو سکتی تھی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور موجودہ صورت حال میں اب بھی اس کا بظاہر کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔

دسمبر ۱۹۴۸ء میں جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا یہ چارٹر منظور کیا تھا اس وقت دنیا میں مسلم ممالک کا کوئی عالمی فورم موجود نہیں تھا، خلافت عثمانیہ کا اس سے قبل خاتمہ ہو چکا تھا اور اس کی جگہ لینے کے لیے کوئی عالمی فورم سامنے نہیں آیا تھا بلکہ اب تک یہی صورت حال ہے، دنیا کے بیشتر مسلم ممالک آزاد نہیں تھے اور کسی نہ کسی استعماری قوت کی نو آبادی شمار ہوتے تھے اور

جنرل اسمبلی میں عالم اسلام کی مکمل نمائندگی نہیں تھی، اس لیے یہ کہنا کہ اقوام متحدہ کی تشکیل اس کے نظام کے تعین اور اس کے معاہدات کی تدوین میں عالم اسلام برابر کا شریک ہے، درست نہیں ہے اور انصاف کی بات نہیں ہے، اس لیے آج بھی مسلم حکومتوں بالخصوص او آئی سی کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور اقوام متحدہ کے تنظیمی ڈھانچے اور اس کے تحت ہونے والے بین الاقوامی معاہدات پر نظر ثانی کا مطالبہ کرتے ہوئے اسلام اور عالم اسلام کی صحیح نمائندگی کا فرض پورا کریں۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ جب اقوام متحدہ خود مذہبی آزادی، لوگوں کے اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق اور علاقائی ثقافتوں کے تحفظ کی علمبردار ہے تو اسے کسی مذہب کی حدود کار متعین کرنے اور اہل مذہب کو اس مذہب کے کچھ حصوں پر عمل سے روکنے کا حق نہیں ہے اور نہ ہی علاقائی ثقافتوں کو انسانی حقوق کے چارٹر کے نام پر بلڈوز کر کے ایک ہی تہذیبی فلسفہ کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کا اس کے پاس کوئی جواز ہے۔

انسانی حقوق اور اسلامی شریعت

ان گزارشات کے بعد ہم انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کا شق وار سرسری جائزہ لینا چاہیں گے، صرف اس پہلو سے کہ اسلامی شریعت کے ایک طالب علم اور نفاذ شریعت کی جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کے طور پر اس سلسلہ میں ہمارے تحفظات کیا ہیں اور اس چارٹر کو مکمل طور پر قبول کر لینے کی صورت میں ہم اسلامی نقطۂ نظر سے کیا خدشات بلکہ نقصانات محسوس کرتے ہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

تمام بنی نوع انسان مساوی اور نا قابل تغیر حقوق اور بنیادی آزادیاں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ ہر فرد کے انسانی حقوق کے تحفظ و ترقی کا پرچم بلند رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ یہ ذمہ داری اور وابستگی اقوام متحدہ کے منشور سے ماخوذ ہے جس میں انسان کی حرمت و وقار اور بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں دنیا کے عوام کے یقین کی توثیق کی گئی۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ''انسانی حقوق کا عالمی منشور'' منظور کر کے اس کا اعلان عام کیا۔

تمہید و متن

چونکہ ہر انسان کی ذاتی عزت اور حرمت اور انسانوں کے مساوی اور نا قابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا اس دنیا میں آزادی، انصاف اور امن کی بنیاد ہے۔

چونکہ انسانی حقوق سے لاپروائی اور ان کی بے حرمتی اکثر ایسے وحشیانہ افعال کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے جس سے انسانیت کے ضمیر کو سخت صدمے پہنچے ہیں۔ عام انسانوں کی بلند ترین آرزو یہ رہی ہے کہ ایسی دنیا وجود میں آئے جس میں تمام انسانوں کو اپنی بات کہنے اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو اور خوف اور احتیاج سے محفوظ رہیں۔

چونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عمل داری کے ذریعے محفوظ رکھا جائے۔ اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ انسان عاجز آ کر جبر اور استبداد کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہوں۔

چونکہ یہ ضروری ہے کہ قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بڑھایا جائے۔

چونکہ اقوام متحدہ کی ممبر قوموں نے اپنے چارٹر میں بنیادی انسانی حقوق، انسانی شخصیت کی حرمت اور قدر اور مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عقیدے کی دوبارہ تصدیق کر دی ہے اور وسیع تر آزادی کی فضا میں معاشرتی ترقی کو تقویت دینے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

چونکہ ممبر ملکوں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی اشتراک عمل سے ساری دنیا میں اصولاً اور عملاً انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا زیادہ سے زیادہ احترام کریں گے اور کروائیں گے۔

چونکہ اس عہد کی تکمیل کے لیے بہت ہی اہم ہے کہ ان حقوق اور آزادیوں کی نوعیت کو سب سمجھ سکیں۔ لہٰذا اَب

جنرل اسمبلی اعلان کرتی ہے کہ

انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کے واسطے حصولِ مقصد کا مشترک معیار ہوگا تا کہ ہر فرد اور ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ان حقوق اور آزادیوں کا احترام پیدا کرے، اور انہیں قومی اور بین الاقوامی کاروائیوں کے ذریعے ممبر ملکوں میں اور ان قوموں میں جو ممبر ملکوں کے ماتحت ہوں منوانے کی بتدریج کوشش کر سکے۔

دفعہ نمبر ۱

تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ نمبر ۲

(۱) ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قوم، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

(۲) اس کے علاوہ جس علاقے سے جو شخص تعلق رکھتا ہے اس کی سیاسی کیفیت کا دائرہ اختیار یا بین الاقوامی حیثیت کی بنا پر اس سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، چاہے وہ ملک یا علاقہ

آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا سیاسی اقتدار کے لحاظ سے کسی دوسرے بندش کا پابند ہو۔

دفعہ نمبر ۳

ہر شخص کو اپنی جان، آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

دفعہ نمبر ۴

کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو، ممنوع قرار دی جائے گی۔

دفعہ نمبر ۵

کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوز یا ذلیل سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ نمبر ۶

ہر شخص کا حق ہے کہ ہر مقام پر قانون اس کی شخصیت کو تسلیم کرے۔

دفعہ نمبر ۷

قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کے خلاف جو تفریق کی جائے یا جس تفریق کے لیے ترغیب دی جائے اس سے سب برابر کے بچاؤ کے حق دار ہیں۔

دفعہ نمبر ۸

ہر شخص کو ان افعال کے خلاف جو اس دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کو تلف کرتے ہوں، بااختیار قومی عدالتوں سے مؤثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا پورا حق ہے۔

دفعہ نمبر ۹

کسی شخص کو محض حاکم کی مرضی پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر ۱۰

ہر ایک شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کا تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے بارے میں مقدمہ کی سماعت آزاد اور غیر جانبدار عدالت کے کھلے اجلاس میں منصفانہ طریقے پر ہو۔

دفعہ نمبر ۱۱

(۱) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری کا الزام عائد کیا جائے بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے۔ تاوقتیکہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع نہ دیا جا چکا ہو۔

(۲) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بنا پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر ۱۲

کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط و کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے گی اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے، ہر شخص کا حق ہے کہ قانون اسے حملے یا مداخلت سے محفوظ رکھے۔

دفعہ نمبر ۱۳

(۱) ہر شخص کا حق ہے کہ اسے ہر ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور سکونت اختیار کرنے کی آزادی ہو۔

(۲) ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو، اور اسی طرح اسے ملک میں واپس آ جانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ نمبر ۱۴

(۱) ہر شخص کو ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ ڈھونڈنے، اور پناہ مل جائے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(۲) یہ حق ان عدالتی کاروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں لایا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصول کے خلاف ہیں۔

دفعہ نمبر ۱۵

(۱) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(۲) کوئی شخص محض حاکم کی مرضی پر اپنی قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور اس کی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار نہ کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر ۱۶

(۱) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملہ میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(۲) شادی فریقین کی مکمل اور آزادانہ رضامندی سے ہوگی۔

(۳) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے' اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے تحفظ کا حق دار ہے۔

دفعہ نمبر ۱۷

(۱) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(۲) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر ۱۸

ہر انسان کو آزادیٔ فکر، آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے، پبلک یا نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسوم پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ نمبر ۱۹

ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے، جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے، علم اور خیالات کی تلاش کرے، انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔

دفعہ نمبر ۲۰

(۱) ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔
(۲) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ نمبر ۲۱

(۱) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔
(۲) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔
(۳) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی سے ہوں گے۔ اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مساوی کسی دوسرے آزادانہ طریقۂ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ نمبر ۲۲

معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی کہ وہ

ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو حاصل کرے جو اس کی عزت اور شخصیت کے نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۳

(۱) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(۲) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(۳) ہر شخص جو کام کرتا ہے، وہ ایسے مناسب و معقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔

(۴) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ نمبر ۲۴

ہر شخص کا آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے علاوہ مقررہ وقفوں کے ساتھ تعطیلات بھی شامل ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۵

(۱) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات شامل ہیں اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا، ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔

(۲) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی سے پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بغیر معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ نمبر ۲۶

(۱) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے، تعلیم مفت ہوگی کم از کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں، ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی، فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(۲) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا، اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی، وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(۳) والدین کو اس بات کے انتخاب کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے۔

دفعہ نمبر ۲۷

(۱) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، ادبیات سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(۲) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفاد کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، عملی یا ادبی تصنیف سے جس کا وہ مصنف ہو، حاصل ہوتے ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۸

ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام میں شامل ہونے کا حق دار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہوسکیں جو اس اعلان میں پیش کر دیے گئے ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۹

(۱) ہر شخص پر معاشرے کے حقوق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر ہی اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

(۲) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے یا جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں۔

(۳) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصول کے خلاف عمل میں نہیں لائی جاسکتیں۔

دفعہ نمبر ۳۰

اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جاسکتی جس سے ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی تخریب ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

انسانی حقوق کے
مغربی تناظر اور اسلامی تناظر کا فرق

تمہید پر تحفظات

تمہید کے سلسلہ میں ہمیں چند باتوں پر تحفظات ہیں:

☆ اس میں مغربی دنیا کے پس منظر کو بنیاد بنایا گیا ہے اور انقلاب فرانس سے پہلے کی صورت حال اور جنگ عظیم اول اور دوم کا باعث بننے والے اسباب کو سامنے رکھا گیا ہے، یہ مغربی دنیا کا پس منظر ضرور ہے لیکن عالم اسلام کا پس منظر قطعی طور پر یہ نہیں ہے، عالم اسلام میں قانون کی حکمرانی، انسانی حقوق کی پاسداری اور معاشرتی انصاف کی فراہمی کی ایک شاندار تاریخ موجود ہے، اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور مغرب اپنے علاقائی پس منظر کے ردعمل میں جس معاشرتی اور تہذیبی نتیجہ تک پہنچا ہے اسے پوری دنیا میں اور خاص طور پر اس پس منظر سے قطعی مختلف ماضی رکھنے والے عالم اسلام پر مسلط کرنے کے درپے ہے جو انصاف کا تقاضہ نہیں ہے۔

☆ مذہب اور مذہبی قیادت نے یورپی ممالک میں یقیناً بادشاہت اور جاگیرداری کی پشت پناہی کی ہے لیکن عالم اسلام میں مذہبی قیادت علمی وفکری طور پر ہمیشہ آزاد رہی ہے اور حکمرانوں کے مظالم کے مقابلہ میں عوام کے ساتھ رہی ہے، اس لیے جو سزا مغرب نے اپنے مذہب کے لیے تجویز کی ہے اسے عالم اسلام اور دین اسلام پر چسپاں کرنا سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔

مرد اور عورت میں مساوات

مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق سے مراد اگر یہ ہے کہ ہر معاملہ میں ان کے ساتھ برابری کا معاملہ کیا جائے جیسا کہ عام طور پر اس کی یہی تشریح کی جارہی ہے تو یہ نہ صرف ناممکن ہے بلکہ عقل اور انصاف کے بھی خلاف ہے، اس لیے کہ مرد اور عورت کی تخلیق اور جسمانی ڈھانچے میں فرق ہے، ان کی نفسیات اور ذہنی کیفیات میں فرق ہے، ان کے فطری فرائض میں فرق ہے، اور ان کی قوت کار میں فرق ہے، اس فرق کو نہ ختم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور اس فرق کی موجودگی میں ہر معاملہ میں برابری ممکن نہیں ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے اس کے لیے بہت خوبصورت اور فطری اصول بیان فرمایا ہے کہ

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ (البقرہ ۲۲۸)

''عورتوں کے حقوق ان کی ذمہ داریوں کے حساب سے ہیں، اور مردوں کی ان پر فضیلت ہے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔''

مردوں اور عورتوں کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم ان کی جسمانی تخلیق، ذہنی نفسیات، فطری فرائض اور قوت کار کے حساب سے ہوگی تو وہی تقسیم فطری ہوگی اور وہی دراصل مساویانہ ہوگی، اس سے ہٹ کر کوئی بھی معاملہ فطرت اور انصاف سے انحراف متصور ہوگا۔

خاندان سوسائٹی کا ایک بنیادی یونٹ ہے جس کا وجود اور بقا سوسائٹی کی ضروریات سے ہے۔ خاندان میاں بیوی اور اولاد پر مشتمل ہوتا ہے اور ان چند افراد میں کسی ایک کا انتظامی سربراہ قرار پانا خاندان کی فطری ضرورت ہے جسے قرآن کریم نے وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ سے تعبیر کیا ہے۔ خاندان ایک ادارہ ہے اور کسی بھی ادارے کا نظام صحیح چلانے کے لیے نظم ونسق ایک ہاتھ میں ہوگا تو معاملات صحیح چلیں گے اور اگر برابر کے اختیارات کے دو مینیجر کسی ادارے میں بٹھا دیے جائیں گے تو وہ کوئی بھی ادارہ ہو، تباہی کا شکار ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظام صحیح طور پر چلنے کی وجہ بھی یہی بتائی ہے کہ نظام ایک ہاتھ میں ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔(الانبیاء۲۲)

''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو دونوں خراب ہو جاتے، سو اللہ عرش کا مالک ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔''

اگر خدائی اختیارات کی حامل کوئی اور شخصیت اور ذات بھی موجود ہوتی تو کائنات درہم برہم ہو جاتی، اسی طرح خاندان کا نظام صحیح طور پر چلانے کے لیے ضروری ہے کہ منتظم ایک ہو۔

عورت کو اسلام نے مرد کی مشیر و معاون بنایا ہے بلکہ جناب نبی اکرمؐ نے **والمرأة راعية في بيت زوجها** کہا ہے کہ گھر کے اندر کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کے بارے میں مسئولہ اور ذمہ دار ہے لیکن اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ (النساء ۳۴) اور وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَة (البقرہ ۲۲۸) فرما کر گھر کا نظم طے کیا ہے کہ سنیارٹی اور انتظامی کنٹرول مرد کے ہاتھ میں ہے اور یہی فطرت اور نظم کا تقاضہ ہے۔

مغربی دنیا آج بھی اپنے خاندانی نظام کے بکھر جانے سے پریشان ہے اور بہت سے مغربی دانشور اس پر الجھن کا اظہار کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ مغرب نے خاندانی نظام کی فطری درجہ بندی کا لحاظ نہیں رکھا اور مرد اور عورت کو یکساں اختیارات کا حامل قرار دے کر اپنے خاندانی نظام کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔

پوری نسل انسانی کے لیے مشترکہ معیار

تمہید میں انسانی حقوق کے اس چارٹر کو تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا ''مشترک معیار'' قرار دیا گیا ہے جو محل نظر ہے، اس لیے کہ جب یہ چارٹر ترتیب دیا جا رہا تھا تو انسانی آبادی کے ایک بڑے حصے میں معاشرتی کردار رکھنے والے مذاہب اور ثقافتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا، مغرب اگر اپنی سوسائٹی میں اپنے مذہب کے ظالمانہ کردار سے ناراض ہے تو اس مذہب سے انکار اس کا حق ہے لیکن باقی مذاہب کے بارے میں اس قسم کا فیصلہ کرنا اس کا حق نہیں ہے، اس سلسلہ میں عالم اسلام کی پوزیشن ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، لیکن انسانی حقوق کے چارٹر کی تشکیل کے وقت

چین بھی اس سے باہر تھا اور تائیوان کے ایک جزیرے کو چین قرار دے کر محض خانہ پُری کی گئی تھی، اسی وجہ سے عوامی جمہوریہ چین کو بھی جو دنیا کی انسانی آبادی کے کم وبیش ایک چوتھائی حصے پر مشتمل ہے، انسانی حقوق کے بارے میں مغربی دنیا کی تعبیرات وتشریحات پر مسلسل تحفظات رہتے ہیں۔ دنیا کی علاقائی تہذیبوں، ثقافتوں اور معاشرتی کردار رکھنے والے مذاہب کو نظر انداز کر کے تشکیل دیے جانے والے چارٹر کو تمام اقوام کے واسطے ''مشترکہ معیار'' قرار دیا جانا ان کی ثقافتوں اور مذاہب کی نفی کے مترادف ہے اور عالم اسلام کے لیے نہ یہ نفی قابل قبول ہے اور نہ ہی وہ اپنے دین ومذہب کے معاشرتی کردار سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہے، اس لیے ان زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر اس چارٹر پر نظر ثانی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

دفعہ نمبر ۱ تا ۳ (اقوام متحدہ کی دورُخی پالیسی)

دفعہ نمبر ۱ تا ۳ سے ہمیں اصولی طور پر اتفاق ہے اور اسلامی تعلیمات بھی ان حوالوں سے اسی نوعیت کی چلی آ رہی ہیں، البتہ موجودہ حالات میں ان اصولوں کی تطبیق اور مغربی ممالک حتیٰ کہ اقوام متحدہ کے عملی کردار کے بارے میں ہمیں تحفظات ہیں، مثلاً دفعہ میں انسانوں کے درمیان ''نسلی فرق'' کی نفی کی گئی ہے جبکہ نسلی امتیاز اور برتری کی بنیاد پر قائم کی جانے والی یہودی ریاست اسرائیل کی مکمل سرپرستی کی جا رہی ہے۔

دفعہ نمبر ۴ (غلامی کا مسئلہ)

دفعہ نمبر ۴ ''غلامی کے خاتمے'' کے بارے میں ہے، ہمیں اس سے بھی اختلاف نہیں اور عالم اسلام نے اسے عملاً قبول کر رکھا ہے۔ چنانچہ گزشتہ ایک صدی کے دوران دنیا بھر میں جہاں بھی شرعی بنیادوں پر ''جہاد'' کیا گیا ہے اس کے نتیجے میں کسی کو غلام یا لونڈی نہیں بنایا گیا اور نہ ہی موجودہ وقت میں دنیا کے کسی بھی حصے میں جہاد کے عنوان سے جنگ لڑنے والے گروہ کسی کو غلام یا لونڈی بنا رہے ہیں، لیکن اسلام اور غلامی کے بارے میں چونکہ بین الاقوامی سطح پر کنفیوژن پایا جاتا ہے اس لیے اس حوالہ سے کچھ باتیں پیش کرنا ضروری ہیں:

جاہلیت کے دور میں کسی کو غلام یا لونڈی بنانے کے عام طور پر تین طریقے ہوتے تھے:

(۱) طاقت ور لوگ کمزور لوگوں کو زبردستی پکڑ کر بیچ دیتے تھے اور وہ غلام تصور کیے جاتے تھے، جناب نبی اکرمؐ کے صحابہ کرامؓ حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ اسی طریقہ سے غلام بنے تھے۔

(۲) قرضے یا تاوان کے بوجھ تلے دبا ہوا شخص قرضہ ادا نہ کر سکنے کی پوزیشن میں خود کو قرض خواہ یا تاوان وصول کرنے والے کے حوالے کر دیتا تھا اور وہ اسے فروخت کر دیتا تھا۔

(۳) جنگوں میں قید ہو جانے والے افراد کو اجتماعی قید خانے میں ڈالنے کی بجائے غلام اور لونڈیاں بنا کر تقسیم کر دیا جاتا تھا اور وہ ان لوگوں کی ملکیت ہوتے تھے۔

جناب نبی اکرمؐ نے پہلی دونوں صورتوں کو **بیع الحر حرام** اور **ثمن الحر حرام** فرما کر ممنوع قرار دے دیا تھا، اور اس ارشاد گرامی کے بعد مسلم معاشرہ میں اس نوعیت کی غلامی کا وجود باقی نہیں رہا تھا، البتہ جنگوں میں قید ہونے والوں کی غلامی کو اسلام نے باقی رکھا لیکن قطعی حکم کے طور پر نہیں بلکہ **فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً ا حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْ زَارَهَا** (محمد ۴) فرما کر قرآن کریم نے جنگی قیدیوں کے بارے میں دو متبادل صورتیں بھی بیان فرمائی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''غلام بنانا'' حکم نہیں بلکہ مختلف صورتوں میں بطور آپشن ایک صورت ہے جس کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ قرآن کریم نے غلاموں کو آزاد کر دینے کی ترغیب دی ہے اور ان کے حقوق بھی متعین فرمائے ہیں اور انہیں بلاوجہ سزا دینے اور ان کی طاقت سے زیادہ کام لینے سے منع فرمایا ہے، حتیٰ کہ حضرت ابو مسعود انصاریؓ کو جناب نبی اکرمؐ نے صرف اس وجہ سے لونڈی کو آزاد کر دینے کا حکم دیا تھا کہ انہوں نے لونڈی کو تھپڑ مار دیا تھا۔

بہر حال غلامی کی یہ صورت حکم کے طور پر نہیں بلکہ آپشن کے طور پر باقی رکھی ہے جس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس زمانے میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوتے تھے اور اس وقت کا عالمی عرف یہی تھا، اسی وجہ سے آج کے عالمی عرف کو قبول کرتے ہوئے عالم اسلام نے شرعی جنگوں میں کسی کو غلام یا لونڈی بنانے سے گریز کا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔

بین الاقوامی معاہدات اور اسلام

بین الاقوامی معاہدات کے بارے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جو بات قرآن وسنت کے کسی قطعی اور صریح حکم سے متصادم ہو اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی معاملہ میں کوئی متبادل صورت موجود ہے یا اجتہاد کے شرعی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے کوئی صورت اختیار کی جاسکتی ہے تو بین الاقوامی معاہدہ کی صورت میں اسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ غلامی کے بارے میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی اس دفعہ کو اور جنیوا کنونشن کی صورت میں بین الاقوامی معاہدہ کو عالم اسلام نے اسی اصول کے تحت قبول کر رکھا ہے اور اس پر ملت اسلامیہ عمل بھی کر رہی ہے۔

اس شق کے حوالہ سے ہم پر مغرب کا یہ اعتراض ہے کہ جب غلامی کے خاتمہ کو عالم اسلام نے عملاً قبول کر لیا ہے تو پھر غلامی کے بارے میں قرآن کریم کی آیات، جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات اور فقہ اسلامی کے ابواب کو دینی تعلیم کے نصاب میں پڑھایا کیوں جا رہا ہے اور انہیں نصاب سے خارج کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ قرآن وسنت کے احکام وقوانین ابدی ہیں، انہیں منسوخ کرنے کی کوئی اتھارٹی موجود نہیں ہے اور ہم نے غلامی کے بارے میں موجودہ بین الاقوامی معاہدات کو قرآن وسنت کے احکام وقوانین میں نسخ کی بنیاد پر نہیں بلکہ موجودہ حالات میں ان کی تطبیق کے حوالہ سے قبول کیا ہے اور یہ اسی وقت تک ہے جب تک موجودہ حالات اور عالمی عرف باقی ہے، یہ نسخ نہیں بلکہ تطبیق کی ایک عملی صورت ہے، آئندہ کسی دور میں اگر پہلے والے حالات اور عالمی عرف لوٹ آئے تو قرآن وسنت کے ان احکام و قوانین پر اسی طرح عمل ہوگا جیسا پہلے دور میں ہوتا رہا ہے۔

غلامی کے بارے میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ آزاد انسانوں پکڑ کر بیچ دینا جسے ''بردہ فروشی'' کہا جاتا ہے، امریکہ میں صدر ابراہام لنکن کے دور تک موجود رہا ہے۔ اس سے قبل افریقہ سے لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں جہازوں میں بھر کر لایا جاتا تھا اور غلام بنا کر بیچ دیا جاتا تھا۔ امریکہ کی سیاہ فام آبادی انہی غلاموں کی اولاد ہے، صدر ابراہام لنکن نے غلامی کے

خاتمے کا قانون نافذ کیا، لیکن ان سیاہ فاموں کو اس کے بعد بھی گوروں کے برابر شہری حقوق حاصل نہیں تھے اور نہ ہی وہ ووٹ اور رائے کا حق رکھتے تھے، ووٹ کا حق انہیں ۱۹۶۴ء میں صدر جان ایف کینیڈی کے دور میں سیاہ فام لیڈر مارٹن لوتھر کنگ کی عوامی تحریک کے نتیجے میں دستوری طور پر دیا گیا، اس وقت تک وہ ووٹ کے حق سے محروم تھے۔

دفعہ نمبر ۵ (اسلامی حدود و تعزیرات پر اعتراض کی بنیاد)

دفعہ نمبر ۵ میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جائے گا جو ظالمانہ ہو، جس میں جسمانی تشدد ہو اور جو گھٹیا سلوک ہو۔

اقوام متحدہ کے ادارے اور بین الاقوامی لابیاں اس کی تشریح یہ کرتی ہیں کہ جسمانی تشدد، ذہنی اذیت اور توہین و تذلیل والا سلوک کسی شخص کے ساتھ نہیں کیا جائے گا۔ سلوک کی حد تک یہ بات ہمارے لیے بھی قابل قبول ہے بلکہ یہ اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کی ہدایت کی ہے لیکن اس دفعہ میں ''یا سزا نہیں دی جائے گی'' کہہ کر سزاؤں کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی بھی جرم میں دی جانے والی سزا کو جسمانی تشدد، ذہنی اذیت اور توہین و تذلیل سے خالی ہونا چاہیے اور جس سزا میں ان میں سے کوئی بات پائی جاتی ہے، وہ انسانی حقوق کے منافی تصور ہوگی۔

معاشرتی جرائم کی اسلامی سزاؤں کو اسی وجہ سے انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جاتا ہے کہ ان میں قتل کرنے، سنگسار کرنے، ہاتھ پاؤں کاٹنے، قصاص میں جسمانی اعضاء قطع کرنے، کوڑے مارنے اور کھلے بندوں لوگوں کے سامنے سزا دینے کی صورتیں موجود ہیں، قرآن وسنت کی بیان کردہ ان سزاؤں کو نہ صرف انسانی حقوق کے منافی کہا جاتا ہے بلکہ نعوذ باللہ وحشیانہ، ظالمانہ اور غیر انسانی سزاؤں سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے موقف کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ سزائیں قرآن کریم نے ازسرنو طے نہیں کیں بلکہ یہ ساری سزائیں تورات کی بیان کردہ سزائیں ہیں جو آج بھی دنیا میں پڑھی جانے والی بائبل میں اسی طرح موجود ہیں۔ قرآن کریم نے بعض اصلاحات کے ساتھ توریت کی ان سزاؤں

کے تسلسل کو باقی رکھا ہے۔ جبکہ دوسری بات یہ ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسانی معاشرہ میں جرائم کا خاتمہ سخت سزاؤں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آج سعودی عرب میں جرائم کی شرح کم بیان کی جاتی ہے حتیٰ کہ حرمین شریفین میں مختلف رنگوں، نسلوں اور ثقافتوں کے لوگ ہر وقت جمع رہنے کے باوجود جرائم کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی وجہ حرمین شریفین کے تقدس کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کے عدالتی نظام کی وہ سخت سزائیں بھی ہیں جو اسلام کی شرعی سزائیں ہیں۔ اسی طرح دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے دور میں جرائم کا مکمل خاتمہ ہو گیا تھا، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ امارت اسلامی افغانستان میں طالبان نے اسلام کی شرعی سزاؤں کو عملاً نافذ کر رکھا تھا، جن کی برکت سے جرائم کا وجود نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

دفعہ نمبر ۶ تا ۱۵

دفعہ نمبر ۶ تا ۱۵ کی باتوں سے ہمیں بھی اتفاق ہے اور بظاہر ان کے حوالہ سے ہمیں کوئی اشکال نہیں ہے۔

دفعہ نمبر ۱۶ (خاندانی نظام اور اسلامی تعلیمات)

البتہ دفعہ ۱۶ بطور خاص قابل توجہ ہے جس میں خاندانی نظام کا ڈھانچہ بیان کیا گیا ہے۔ اس دفعہ پر غور کیا جائے تو تین باتیں زیادہ غور کی مستحق ہیں:

☆ نکاح کا حق بالغ مردوں اور عورتوں کو ہے گویا نابالغ لڑکے اور لڑکی کے نکاح کو تسلیم نہیں کیا گیا، اسی لیے کم وبیش ہر ملک میں نکاح کے لیے لڑکے اور لڑکی کی عمر مقرر ہے اور اس سے کم عمر میں نکاح کو قانوناً تسلیم نہیں کیا جاتا۔ مثلاً پاکستان میں نکاح کے لیے لڑکے کی عمر ۱۸ سال اور لڑکی کی عمر ۱۶ سال ہے۔ اس سے کم عمر میں اگر نکاح ہوا ہے تو وہ قابل سزا جرم تصور ہوتا ہے اور شکایت کرنے پر اس کے خلاف مقدمہ درج کیا جاتا ہے۔ اس طرح ہمارے ہاں حدیث وفقہ کی کتابوں میں نکاح صغیر اور نکاح صغیرہ اور اس کے ساتھ ولایت کے جو احکام ہیں وہ موقوف ہو جاتے ہیں اور اگر اس کے ساتھ اس بات کو بھی

پیش نظر رکھ لیا جائے تو معاملہ اور زیادہ تعجب انگیز ہو جاتا ہے کہ مرد اور عورت باہمی رضامندی سے زنا کا ارتکاب کریں تو وہ آج کے عالمی عرف میں جرم نہیں سمجھا جاتا، گویا مقررہ حد سے کم عمر کا لڑکا یا لڑکی زنا کریں تو جرم نہیں ہے اور اگر باقاعدہ نکاح کر لیں تو یہ جرم تصور ہوگا۔

☆ مرد اور عورت کے باہمی نکاح میں رنگ، نسل، قومیت اور مذہب کو رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے، اس میں مذہب کے حوالہ سے ہمارا اختلاف موجود ہے۔ اس لیے کہ اسلام کسی مسلمان لڑکی کا نکاح غیر مسلم کے ساتھ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور مسلمان مرد کا نکاح بھی کسی غیر مسلم خاتون کے ساتھ کرنا شرعًا جائز نہیں، سوائے اس کے کہ لڑکی اہل کتاب میں سے ہو اور خدا، رسول اور قیامت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی بنیادی باتوں پر یقین رکھتی ہو۔

نکاح وغیرہ کے مسائل یعنی خاندانی زندگی کے احکام میں آج کے عالمی فلسفہ کے ساتھ مسلمانوں کا ایک بڑا تنازعہ یہی ہے کہ انسانی حقوق کے چارٹر کی اس دفعہ کی رو سے یہ تقاضہ کیا جا رہا ہے کہ مسلمان اور غیر مسلموں کے باہمی نکاح کی اجازت دی جائے، مگر مسلمان علماء دنیا میں کسی بھی جگہ قرآن وسنت کے صریح احکام کی وجہ سے یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ خاص طور پر مغربی ممالک میں جب کوئی مسلمان لڑکی غیر مسلم مرد سے یا مسلمان مرد کسی غیر مسلم عورت سے نکاح کرتا ہے اور اس پر اعتراض کیا جاتا ہے تو وہاں کی عدالتیں اس اعتراض کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اس نکاح کو جائز قرار دے دیتی ہیں۔

☆ نکاح کے دوران یعنی ازدواجی زندگی میں میاں بیوی کو بالکل برابر قرار دے کر خاندان کی سربراہی کے معاملہ میں مرد کے حق کی نفی کی گئی ہے جس کے بارے میں ہم تمہید کے ضمن میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے منافی ہے کہ اسلام نے مرد کو گھر کا حاکم قرار دیا ہے بلکہ یہ گھر کے نظم کے حوالہ سے بھی غیر معقول بات ہے، اس لیے کہ کسی ایک کی انتظامی برتری کو تسلیم کیے بغیر گھر کا نظام چلنا اور اس کا باقی رہنا ممکن نہیں ہے۔

☆ نکاح کو فسخ کرنے کے بارے میں مرد اور عورت کے حق کو برابر قرار دیا گیا ہے، یہ بھی اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے کہ اسلام مرد کو براہ راست طلاق کا جو حق دیتا ہے وہ عورت کو حاصل نہیں ہے اور انسانی حقوق میں مرد اور عورت کی مساوات کے نام پر یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ مرد کی طرح عورت کو طلاق کا برابر کا قانونی حق دے کر عورت اور مرد کے درمیان مساوات قائم کی جائے۔

اسلام نے عورت کو طلاق کا حق نہیں دیا لیکن مطالبۂ طلاق کا حق دیا ہے جسے خلع کہا جاتا ہے اور اس مطالبۂ حق کو پورا کرنا صرف خاوند پر موقوف نہیں ہے بلکہ اگر عورت کا مطالبہ جائز ہے اور مطالبہ کے وجوہ درست ہیں تو خاوند کے علاوہ تحکیم اور قضا کی صورت میں عورت کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے راستے موجود ہیں، کیونکہ حَکم اور قاضی عورت کا مطالبہ درست ہونے کی صورت میں خاوند کی مرضی کے بغیر بھی نکاح کو فسخ کر سکتے ہیں۔ اس لیے اسلامی قانون کے بارے میں یہ تأثر درست نہیں ہے کہ اس میں عورت کو مکمل طور پر مرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے البتہ یہ بات درست ہے کہ اسلام نے مرد کو براہ راست طلاق کا حق دیا ہے لیکن عورت کو یہ حق بالواسطہ دیا ہے جو مرد اور عورت کی نفسیات میں واضح فرق کے باعث معقول اور منطقی بات ہونے کے ساتھ ساتھ خاندان کی بقا اور تحفظ کے لیے بھی ضروری ہے۔

مسلم حکمرانوں کا طرز عمل

اس سلسلہ میں عجیب بات یہ ہے کہ انسانی حقوق کے فلسفہ کے اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں جو عائلی قوانین نافذ کیے گئے، ان میں نکاح کے فارم میں ''تفویض طلاق'' کا ایک مستقل خانہ درج کر کے مغرب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی، یہ ایک درمیانی صورت تھی کہ خاوند کا بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دینا شرعاً بھی درست ہے اور اس سے مغرب کو بھی کسی حد تک مطمئن کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ خانہ عملاً غیر مؤثر ثابت ہوا ہے اس لیے کہ اکثر و بیشتر نکاحوں میں اس خانہ کی طرف توجہ ہی نہیں دی جاتی اور نہ ہی فارم میں کسی نکاح کے اندراج کے موقع پر اس سوال کو سنجیدگی سے لیا جاتا ہے، اس لیے مغرب کا یہ دباؤ اور مطالبہ پھر

شروع ہوگیا کہ عورت کو قانون میں صراحت کے ساتھ مرد کے برابر طلاق کا حق دیا جائے۔ اس کا حل ہمارے ہاں اب یہ سامنے آیا ہے کہ بعض عدالتی فیصلوں میں خلع کو عورت کا مساوی حق طلاق قرار دیا گیا ہے اور خلع کے قانونی طریق کار کے لیے سپریم کورٹ کے ایک سابق جج کی سربراہی میں قائم کیے جانے والے ''خواتین حقوق کمیشن'' نے اس سلسلہ میں نئے قانون کے نفاذ کے لیے جو سفارشات پیش کی ہیں ان میں خلع کو عورت کے مساوی حق طلاق کا درجہ دیا گیا ہے۔

بہرحال خاندانی قوانین کے حوالہ سے مغربی فلسفہ اور اسلامی تعلیمات کے درمیان یہ ایک بنیادی تنازعہ ہے جو انسانی حقوق چارٹر کی اس دفعہ کی بنیاد پر کھڑا ہوا ہے اور مسلسل جاری ہے۔ اس کے ساتھ ہی عورت اور مرد میں مکمل مساوات کے حوالہ سے ایک اصولی بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ مرد اور عورت کے بارے میں قوانین، احکام اور معاشرتی روایات کے فرق کو ''جنس کی بنیاد پر امتیاز'' قرار دیا جاتا ہے اور جنس کی بنیاد پر امتیازی قوانین کے مکمل خاتمہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ حکم، قانون اور ضابطہ کے باب میں مرد اور عورت کے سلسلہ میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے اور جہاں بھی کوئی فرق موجود ہے اسے امتیازی قانون یا امتیازی رویہ قرار دے کر اس کے خاتمہ پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں بات کو سمجھنے کے لیے ان چند پہلوؤں پر نظر ڈال لی جائے تو ''امتیازی قوانین'' کے خاتمہ کا یہ موقف مزید واضح ہو جاتا ہے:

☆ اسلام میں عورت کو حکمرانی کے حق سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

☆ عورت مذہبی معاملات میں خطابت و امامت کی ذمہ داری سے مستثنیٰ ہے۔

☆ وراثت کے حصوں میں مردوں اور عورتوں کو بیشتر صورتوں میں برابر کا حق نہیں دیا گیا۔

اور اس قسم کے اور بہت سے امور ہیں جہاں قرآن وسنت نے مرد اور عورت کے لیے الگ الگ احکام وقوانین بیان کیے ہیں۔ یہ سب صورتیں مغرب کی نظر میں مرد اور عورت میں مساوات کے مبینہ اصول کے منافی ہیں اور امتیازی قانون یا رویہ کہلاتی ہیں۔

امتیازی قوانین اور اسلام

ہم نے ان سطور میں صرف فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرد اور عورت میں مکمل

مساوات کے قیام اور امتیازی قوانین کے خاتمہ کے لیے قرآن وسنت کے کون کون سے احکام میں خدانخواستہ ردوبدل کرنا ضروری ہوجاتا ہے، ہم اس حوالہ سے دلائل کی بحث میں نہیں پڑے، اگر کوئی صاحب علم ودانش دلائل اور منطق کے ساتھ اس بحث کی طرف توجہ دے سکیں تو یہ ان کی بڑی دینی خدمت ہوگی۔ البتہ تفصیلات میں جائے بغیر صرف ایک اصولی بات کی طرف متوجہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی جگہ ایک فورم میں راقم الحروف سے سوال کیا گیا کہ کیا مرد اور عورت کے بارے احکام وقوانین میں فرق ہونا چاہیے؟ میں نے عرض کیا کہ کیا مرد اور عورت میں کوئی فرق موجود ہے؟ سوال کرنے والے نے جواب دیا کہ یہ فرق تو ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر مرد اور عورت کی تخلیق میں، ذہنی رجحانات میں، نفسیات میں، قوت کار میں، فطری فرائض میں اور طرز عمل میں فرق موجود ہے جسے کسی طرح بھی ختم نہیں کیا جاسکتا تو ان کے بارے میں احکام وقوانین کا فرق بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر سوسائٹی کے نظام کو اور خاص طور پر خاندانی سسٹم کو صحیح طور پر نہیں چلایا جاسکتا۔

دفعہ نمبر ۱۷

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی دفعہ نمبر ۱۷ کے بارے میں ہمیں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

دفعہ نمبر ۱۸، ۱۹ (آزادئ مذہب اور آزادئ رائے)

البتہ دفعہ نمبر ۱۸ اور دفعہ نمبر ۱۹ پر ضرور بات کرنا چاہیں گے، اس لیے کہ ان دو دفعات پر عالم اسلام اور مغرب کے درمیان دو بڑے تنازعات کی بنیاد ہے۔ ایک جھگڑا آزادئ مذہب کے عنوان سے ہے اور دوسرے تنازعہ کا عنوان ''آزادئ رائے'' ہے۔ آزادئ مذہب اور آزادئ رائے کی حدود کیا ہیں؟ اور ان کے بارے میں آج کی دنیا کے ساتھ ہم مسلمانوں کا تنازعہ کیا ہے؟ اس کی عملی صورتیں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے اور توہین رسالت پر موت کی سزا کے قانون پر ایک عرصہ سے جاری عالمی کشمکش اور مباحثہ اور اس کو اس کے اصل تناظر میں سمجھنا بہت ضروری ہے۔

مغرب چونکہ ریاستی، حکومتی اور معاشرتی معاملات میں مذہب کے کردار سے دست بردار ہو چکا ہے اور اس کے نزدیک مذہب صرف فرد کی ذاتی رائے اور ترجیح کا معاملہ ہے اس لیے اس کا خیال ہے کہ ریاست اور حکومت کو مذہبی معاملات میں فریق نہیں بننا چاہیے، یہ فرد کا ذاتی حق ہے کہ وہ کوئی عقیدہ رکھے یا نہ رکھے، کسی کی عبادت کرے یا نہ کرے، ایک مذہب ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کر لے، اپنے مذہب کا کھلم کھلا پرچار کرے، دوسروں کو اپنا مذہب قبول کرنے کی دعوت دے اور اپنی مذہبی رسوم آزادی کے ساتھ ادا کرے، اس کے اس حق میں مداخلت کا حکومت یا ریاست کو حق حاصل نہیں ہے، اسی طرح ریاست وحکومت کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ مذہب کے حوالہ سے اپنے شہریوں کے درمیان کوئی فرق روا رکھے اور مختلف مذاہب کے لوگوں کے لیے الگ الگ قانون اور احکام نافذ کرے، اگر حکومت کسی فرد یا گروہ کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرتی ہے تو اسے مذہبی آزادی میں مداخلت قرار دیا جاتا ہے اور اگر مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں الگ الگ احکام وقوانین کا نفاذ کرتی ہے تو اسے مذہبی امتیاز کا قانون کہا جاتا ہے اور اسے ختم کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ دفعہ نمبر ۱۸ میں مذہبی آزادی کی جو حدود بیان کی گئی ہیں ان کی بنیاد پر ہمارے ہاں پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی دستوری دفعہ اور انہیں اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ سے روکنے والے امتناع قادیانیت آرڈیننس کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور اسے ختم کرنے کا عالمی سطح پر مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح بعض دوسری اقلیتیں بالخصوص مسیحی آبادی بھی بعض ملکی قوانین کو مذہبی آزادی کے منافی اور مذہبی امتیاز پر مبنی قوانین قرار دے کر ان کے خاتمہ کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں۔

جبکہ اس سلسلہ میں اصل صورت حال یہ ہے کہ پاکستان اپنے وجود اور دستور دونوں حوالوں سے ایک نظریاتی اسلامی ریاست ہے جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حدود میں اس نظریہ و مذہب کا نہ صرف تحفظ کرے بلکہ اس کے احکام وقوانین کا نفاذ عمل میں لائے اور ملک میں ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کرے۔ اس لیے اسلامی عقیدہ وثقافت کی حفاظت اور اسلامی احکام وقوانین کی عملداری حکومت پاکستان کا ریاستی فریضہ قرار پاتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے کسی بھی ملک کی حکومت کا یہ اولین فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دستور کا تحفظ کرے، اس کا نفاذ کرے اور اس کے

منافی کوئی کام اپنے ملک میں نہ ہونے دے، کسی بھی ملک کے دستور کی بنیادوں اور اصولوں سے اتفاق یا اختلاف ایک الگ امر ہے لیکن ملک کے اندر اس کے تحفظ و نفاذ کا معاملہ اس سے مختلف امر ہے۔ مثلاً فرانس کے دستور کی بہت سی باتوں سے خود اس ملک کے بہت سے شہریوں کو نظری طور پر اختلاف ہوگا لیکن ملک کے شہری کی حیثیت سے اس اختلاف کے باوجود اس دستور کو ماننا اور اس پر عمل کرنا اس کی ذمہ داری ہے اور اس سے اس پر عمل کرانا حکومت کا فرض ہے۔ اگر وہ اختلاف کی بنیاد پر ملک کے دستور کی کسی بات پر عمل کرنے سے انکار کرے گا تو یہ اختلاف نہیں رہے گا بلکہ بغاوت کی شکل اختیار کر لے گا جس کی اجازت دنیا کا کوئی ملک یا حکومت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

پاکستان کا اسلامی تشخص

پاکستان جب دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوؤں سے الگ معاشرت و ثقافت کے حوالہ سے تشکیل پایا تھا اور جب اس کا دستور اسلامی بنیادوں پر طے پایا تھا، ان دونوں مواقع پر اس خطہ میں موجود غیر مسلم اقلیتیں اس عمل میں شریک تھیں اور انہوں نے اسلام کی بنیاد پر پاکستان کی تشکیل اور نظریاتی بنیادوں پر دستور کی تدوین کے عمل کو تسلیم کیا تھا جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حدود میں رہنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سوشل کنٹریکٹ اور سماجی معاہدہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور جب اقوام متحدہ نے پاکستان کی اس امتیازی حیثیت کے باوجود اس کی رکنیت کو قبول کر رکھا ہے اور پاکستان اپنے اسلامی تشخص اور نظریاتی دستور کی موجودگی میں اقوام متحدہ کا سرگرم رکن ہے تو گویا عالمی سطح پر بھی پاکستان کے اس امتیازی تشخص کو قبول کر لیا گیا ہے۔ اور یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان اور دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے دونوں مواقع پر پاکستان کے اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کا فیصلہ ملک کے عوام پر جبر کے ذریعہ مسلط نہیں کیا گیا بلکہ آزادانہ عوامی رائے اور مکمل جمہوری عمل کی صورت میں عوام کے منتخب نمائندوں نے یہ فیصلے کیے ہیں تو ان زمینی حقائق کی موجودگی میں دنیا میں کسی بھی سطح پر کسی کا یہ حق نہیں رہ جاتا کہ وہ پاکستان کے اس اسلامی نظریاتی تشخص سے انکار کرے اور ملک کے اندر اس اسلامی نظریاتی تشخص کے لیے کیے

جانے والے ریاستی اور حکومتی اقدامات میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

اس اصولی گزارش کے بعد ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ پاکستان میں اپنے دستوری مذہب اسلام کی حفاظت و ترویج اسی طرح ریاست وحکومت کی ذمہ داری ہے جس طرح امریکہ میں امریکی دستور کی حفاظت وتنفیذ وہاں کی حکومت وریاست کی ذمہ داری ہے، جس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ملک میں رہنے والے تمام غیر مسلموں کو یہ حق تو ہے کہ وہ اپنا نظری اختلاف قائم رکھتے ہوئے ملک میں رہیں اور دستور میں اتفاق رائے اور سماجی معاہدہ کی رو سے طے پانے والے اپنے حقوق سے مکمل استفادہ کریں، لیکن اس اختلاف کی بنیاد پر پاکستان کے اسلامی تشخص اور دستور کی اسلامی بنیادوں کو چیلنج کرنے کا حق انہیں کسی طرح بھی حاصل نہیں ہے۔

قادیانی مسئلہ

اس سلسلہ میں قادیانیوں کا موقف اور طرز عمل سب سے زیادہ تعجب انگیز بلکہ مضحکہ خیز ہے کہ وہ عالم اسلام کے اجماعی فیصلے کو ماننے سے انکاری ہیں، پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ کے دستوری فیصلے سے منحرف ہیں، ملک کی سپریم کورٹ کے متفقہ فیصلے کو تسلیم نہیں کر رہے اور پاکستان کے شہریوں کے جمہوری فیصلے سے انحراف کر رہے ہیں، اور اس سب کچھ کے ساتھ ان کا اصرار ہے کہ پوری امت مسلمہ اور ساری کی ساری پاکستانی قوم ان کے سامنے سرنڈر ہو اور تمام جمہوری، عدالتی اور دینی فیصلوں سے دست بردار ہو کر ان کے موقف کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں مسلمان کے طور پر اپنے وجود کا حصہ تسلیم کرے، آج قادیانی گروہ دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے کہ پاکستان میں ان کے انسانی حقوق اور مذہبی آزادی پامال کی جا رہی ہے اور وہ مظلوم ہیں جبکہ بین الاقوامی ادارے اور مغربی ممالک حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے چلے جا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہمارا موقف بالکل واضح ہے کہ مسئلہ قادیانیوں کے مذہبی یا شہری حقوق کا نہیں بلکہ ان کے معاشرتی سٹیٹس اور حقوق کے ٹائٹل کا ہے، وہ اگر اپنے بارے میں دستوری، عدالتی اور شرعی فیصلوں کو قبول کر کے مسلمانوں سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں تو ملک کی دیگر غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ ان کے تمام حقوق محفوظ ہیں اور ان کے کسی

مسلمہ حق سے انکار نہیں ہے، لیکن اگر وہ جمہوری اور دینی فیصلوں کو مسترد کرتے ہوئے دستور و قانون کو چیلنج کرتے ہیں اور مسلم اکثریت کا زبردستی حصہ بننا چاہتے ہیں تو اس کا سرے سے کوئی امکان موجود نہیں ہے۔

آزادئ رائے کی حدود

دفعہ ۱۹ میں آزادئ رائے کی بات کی گئی ہے اور اس کی بنیاد پر کہا جا رہا ہے کہ مذہب اور مذہبی شخصیات سے اختلاف اور ان پر تنقید بھی آزادئ رائے کا حصہ ہے اور اس کو جرم قرار دے کر اس پر موت کی سزا مقرر کرنا آزادئ رائے اور آزادئ ضمیر کے انسانی حق کے منافی ہے۔ یہ بات مغالطہ کے سوا کچھ نہیں، اس لیے کہ اختلاف رائے اور چیز ہے اور توہین اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ مسلمانوں نے علمی اختلاف کا جواب ہمیشہ علمی انداز سے دیا ہے، صدیوں سے مستشرقین اسلام پر، قرآن کریم پر اور جناب نبی اکرمؐ کی شخصیت اور کردار پر اعتراضات کر رہے ہیں اور مسلمان دانش وران کے جوابات دے رہے ہیں، لیکن جناب نبی اکرمؐ یا کسی بھی سچے رسول اور نبی کی توہین کو انہوں نے کبھی برداشت نہیں کیا اور نہ ہی آئندہ کبھی یہ بات برداشت ہو سکتی ہے۔ میں اس کی دو واقعاتی مثالیں دینا چاہوں گا۔ مغرب کے ایک دانش ور سر ولیم میور نے جناب نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر کتاب لکھی اور اس میں بعض اعتراضات کیے، ان میں اعتراضات کا مسلمانوں کی طرف سے کتاب کی صورت میں جواب دیا گیا، لیکن سلمان رشدی نے ''شیطانی آیات'' کے نام سے خرافات کا مجموعہ مرتب کیا جس کی بنیاد علمی یا تاریخی اشکالات پر نہیں بلکہ توہین واستخفاف اور طنز واستہزاء پر تھی، اس لیے اسے برداشت نہیں کیا گیا۔ اسی طرح اب سے ڈیڑھ سو سال قبل لاہور میں ایک ہندو دانش ور پنڈت دیانند سرسوتی نے ''ستیارتھ پرکاش'' کے نام سے کتاب لکھی اور اس کے ایک باب میں قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں سو سے زیادہ اعتراضات کیے، مسلمان علماء نے اس کتاب کا جواب لکھا اور پنڈت سرسوتی سے براہ راست مباحثہ کر کے اسے لاجواب کیا۔ لیکن لاہور میں ہی ایک اور ہندو مصنف راج پال نے ''رنگیلا رسول'' کے نام سے کتاب لکھی جس کا نام ہی توہین آمیز تھا، اسے برداشت نہیں کیا گیا اور غازی علم الدین شہیدؒ نے

اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اختلاف اور توہین میں فرق ہے اور توہین رسالتؐ کو جرم قرار دینے پر اعتراض درحقیقت توہین کو حقوق میں شامل کرنے کی بات ہے جو قطعی طور پر غیر معقول اور ناقابل قبول ہے۔ میں عام طور پر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ دنیا کے ہر ملک میں ''ہتک عزت'' پر قانونی چارہ جوئی کا حق شہریوں کو حاصل ہے اور ''آزالۂ حیثیت عرفی'' سے شہریوں کو قانونی تحفظ دیا جاتا ہے، اگر کسی ملک کے ایک عام شہری کی ہتک عزت اور ازالۂ حیثیت عرفی جرم ہے تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ہتک عزت اور آزالۂ حیثیت عرفی اس سے کئی گنا زیادہ سنگین جرم ہے، اس لیے کہ اس کے ساتھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کروڑوں عقیدت مندوں کے دلی جذبات کی توہین بھی شامل ہو جاتی ہے۔

''آزادیٔ رائے'' کے حوالہ سے ایک اور بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ کم وبیش ہر ملک میں اس کی نظریاتی اساس، اس کے دستور اور قومی شخصیات کی توہین کا کسی کو حق نہیں دیا جاتا، حتیٰ کہ قومی شعائر مثلاً پرچم وغیرہ کی حرمت کے قانونی تحفظ کا اہتمام کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ فوج کی وردی، پولیس کی وردی اور ان کے سٹارز وغیرہ کو بھی قومی شعبوں کی علامات قرار دے کر ان کی توہین کو جرم سمجھا جاتا ہے، اسی طرح اسلام بھی چونکہ ایک اسلامی ریاست کی دستوری اساس ہے، اس لیے اسلام کے شعائر اور دینی علامات کی توہین بھی جرم ہے، اور انسانی حقوق کے نام سے ان شعائر اور علامات کی بے حرمتی کا جواز فراہم کرنا انصاف اور عقل کے خلاف بات ہے۔

ہمارا مغرب سے مطالبہ ہے کہ اختلاف اور توہین کے فرق کو تسلیم کیا جائے اور جس طرح کسی بھی ملک کی قومی شخصیات اور قومی علامات کی حرمت وعزت کو قانونی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے اسی طرح حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، مسلمہ مذاہب اور ان کی علامات وشعائر کے قانونی تحفظ کا حق تسلیم کیا جائے۔

دفعہ نمبر ۲۰ (معاشرہ کی سیاسی گروہ بندی)

دفعہ نمبر ۲۰ کے بارے میں بھی کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس لیے کہ معاشرے کی سیاسی گروہ بندی جناب نبی اکرمؐ کے دور میں بھی موجود تھی جو پہلے قبائل کی صورت میں تھی جیسا کہ

قریش میں سیاسی معاملات کی انجام دہی مختلف شعبوں میں مختلف خاندانوں کے سپرد تھی جبکہ جناب نبی کریمؐ کے وصال کے وقت مہاجرین، انصار اور خاندان نبوت کے الگ الگ سیاسی موقف کی شکل میں اس کا اظہار ہوا، انصار مدینہ نے اپنے طور پر خلیفہ کا انتخاب کرنا چاہا، مہاجرین نے ان سے اختلاف کیا اور حضرت علیؓ نے خاندان نبوت کی طرف سے مہاجرین اور انصار کے فیصلہ پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا جس کی تفصیلات میں جائے بغیر اصولی طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اجتماعی وسیاسی مسائل پر الگ الگ گروہوں کی صورت میں موقف اختیار کرنے اور اس کے لیے جدوجہد کرنے کی عملی شکل اس دور کے اسلامی معاشرہ میں موجود تھی، اسی کی ترقی یافتہ صورت کو اگر جماعت سازی کی بنیاد سمجھ لیا جائے تو ہمیں اس میں کوئی اشکال نظر نہیں آتا۔ البتہ اس انجمن سازی کا بنیادی اصول **وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ** (المائدہ ۲) کے قرآنی ارشاد کو قرار دے کر جماعت سازی کی حدود وشرائط کا تعین ضروری ہوگا۔

دفعہ نمبر ۲۱ (اسلام میں حقِ حکمرانی کی بنیاد)

دفعہ نمبر ۲۱ سیاسی نظام کے بارے میں ہے جس کے تحت اقوام متحدہ کے رکن ممالک نے عالمی سطح پر اس ذمہ داری کو قبول کیا ہے کہ ان کا سیاسی نظام اور حکومتی نظم شہریوں کی اجتماعی رائے کے تابع ہوگا اور عوام کی رائے سے ہٹ کر قائم ہونے والی کوئی حکومت اس چارٹر کی رو سے جائز حکومت متصور نہیں ہوگی۔ اسے جمہوریت کہا جاتا ہے اور عوام کی حاکمیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس حوالہ سے اسلامی تعلیمات، قرآن وسنت کے ارشادات اور خلفاء راشدینؓ کے طرز عمل کی روشنی میں کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری ہے:

خلافت کا دستوری تصور

☆ اسلام میں عوام کی حاکمیت کی بجائے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قرآن وسنت کی پابندی ایک اسلامی حکومت کی بنیاد ہے اور حکمران فرد یا گروہ عوام کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی بجائے قرآن وسنت کے احکام کو نافذ کرنے کا پابند ہے، اس لیے اسلام کے سیاسی نظام

میں نظام حکومت کو حکومت کی بجائے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ حکمران از خود حکومت نہیں کرتا بلکہ قرآن وسنت کے احکام کے نفاذ میں جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتا ہے۔ چنانچہ فقہاء امت نے خلافت کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ خلیفہ وہ ہے جو جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتے ہوئے امت مسلمہ کے اجتماعی معاملات سرانجام دے۔

☆ اسلام میں عوام یا ان کے نمائندوں کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ قرآن وسنت کے صریح اور قطعی احکام میں کوئی ردوبدل کریں، ان کی پابندی ہر حال میں حکمران، عوام اور ان کے نمائندوں پر ضروری ہے، مگر وہ احکام ومسائل جو قرآن وسنت میں موجود نہیں ہیں، یا واضح نہیں ہیں، یا ان کی تعبیر وتشریح میں امت کے اہل علم کی آراء مختلف چلی آرہی ہیں، ان میں اجتہاد کے شرعی اصولوں کے دائرے میں حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلے کیے جاسکتے ہیں۔ البتہ ان میں یہ فرق ضروری ہے کہ جن امور ومسائل کا تعلق عوامی اور انتظامی معاملات سے ہے ان کا فیصلہ کرنا حکومت یا عوام کے نمائندوں کا حق ہے اور جن مسائل کا تعلق شرعی امور اور دینی تعبیر وتشریح سے ہے ان میں مسلمہ اہل علم فیصلے کی اتھارٹی ہوں گے اور انہی کے فیصلے معتبر ہوں گے۔

☆ اسلام میں حکومت کی تشکیل اور خلیفہ کا انتخاب عوام کی رائے پر ہوگا جیسا کہ جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد ان کے جانشین کا انتخاب عوامی بحث ومباحثہ کے بعد عوامی رائے اور انتخاب کے ذریعہ ہوا، اپنا جانشین جناب نبی اکرمؐ نے خود نامزد نہیں فرمایا البتہ اشارات ضرور کیے ہیں لیکن فیصلہ مسلمانوں کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک موقع پر اپنا جانشین نامزد کرنے اور اس کے لیے تحریر لکھوانے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ فرما کر یہ ارادہ ترک کر دیا کہ **یأبی اللّٰہ والمؤمنون الا ابابکر** اللہ تعالیٰ ابوبکر کے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بننے دیں گے اور مسلمان بھی کسی اور کو قبول نہیں کریں گے، یہ ارشاد گرامی جہاں حضرت ابوبکرؓ کے خلیفۂ رسولؐ ہونے کی اہلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں مسلمانوں کی اجتماعی رائے کی

اصابت پر اعتماد کا اظہار بھی ہے۔ چنانچہ عملاً یہی ہوا کہ نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد اس مسئلہ پر اختلاف تو ہوا لیکن بالآخر امت حضرت ابوبکرؓ پر متفق ہوگئی۔

موجودہ دور میں خلافت کا انعقاد

فقہاء اسلام نے خلافت کے انعقاد یعنی ایک اسلامی حکومت کی تشکیل کی جو صورتیں بیان فرمائی ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، کم وبیش سبھی فقہاء نے اس کی پانچ صورتیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) عامۃ المسلمین یا ان کے اہل حل وعقد خلیفہ کا انتخاب کریں جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کا چناؤ کیا گیا تھا، اسے آج کے دور میں براہ راست انتخاب یا بالواسطہ انتخاب کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۲) خلیفۃ المسلمین اپنا جانشین خود نامزد کردے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کر دیا تھا۔

(۳) خلیفۂ وقت کسی ایک فرد کو جانشین بنانے کی بجائے خلافت کے اہل لوگوں کا ایک پینل نامزد کردے اور ان میں سے کسی کو منتخب کیا جائے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے چھ بزرگوں کا پینل نامزد کر دیا تھا اور ان میں سے حضرت عثمانؓ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ فرماتے ہیں جو اس پینل میں شامل تھے اور جنہیں اس پینل نے خلیفہ کے چناؤ کا اختیار دے دیا تھا، ان کا ارشاد ہے کہ وہ مسلسل تین دن تک اس سلسلہ میں لوگوں سے مشاورت کرتے رہے، انہوں نے مدینہ منورہ کا کوئی طبقہ اور حلقہ نہیں چھوڑا جس سے مشاورت نہ کی ہو، حتیٰ کہ انہوں نے مسلسل تین دن اور تین رات تک آنکھ میں نیند کا سرمہ تک نہیں لگایا اور جب یہ اطمینان حاصل کرلیا کہ لوگوں کی عمومی رائے حضرت عثمانؓ کے حق میں ہے تو انہیں خلیفہ نامزد کرنے کا اعلان کر دیا۔

(۴) خلیفہ کے انتقال کے وقت جو ارباب شوریٰ یا اہل حل وعقد موجود ہوں وہ نئے خلیفہ کا انتخاب کرلیں جیسا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ منورہ میں موجود اصحاب شوریٰ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ منتخب کرلیا تھا۔

(۵) خلافت کی اہلیت رکھنے والے کوئی صاحب طاقت کے بل پر اقتدار پر قبضہ کر لیں اور امت انہیں قبول کر لے جیسا کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کو حضرت حسنؓ کی بیعت کے بعد امت نے قبول کر لیا تھا اور وہ اس کے بعد کم وبیش بیس برس تک امت کے متفقہ امیر المؤمنین رہے۔

خلافت کے انعقاد یعنی کسی اسلامی حکومت کی تشکیل اور اس کے جواز کی یہ پانچ صورتیں فقہاء اسلام نے بیان فرمائی ہیں، ان میں سے دوسری، تیسری اور چوتھی صورت تو آج کے دور میں قابل عمل نہیں ہیں، اس لیے کہ اس وقت دنیا میں کوئی شرعی خلیفہ موجود نہیں ہے جو کسی کو اپنا جانشین نامزد کر سکے یا اس کے لیے کوئی پینل مقرر کر سکے اور نہ ہی خلافت کی کوئی باضابطہ شوریٰ موجود ہے جس کے ارکان خلیفہ کا انتخاب کر سکیں، اس لیے آج کے عالمی حالات میں خلافت کے انعقاد یا ایک اسلامی حکومت کی تشکیل کے دو ہی راستے ممکن اور قابل عمل ہیں۔ ایک یہ کہ کسی ملک کے عوام براہ راست یا اپنے معتمد نمائندوں (ارباب حل وعقد) کے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب کریں اور دوسرا یہ کہ خلافت کی اہلیت رکھنے والا کوئی شخص طاقت کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کر لے اور ملک کے عوام اسے بطور حکمران قبول کر لیں یعنی عملاً اس کی رٹ قائم ہو جائے۔

(شیعہ سنی اختلاف اور خلافت وامامت کے حوالہ سے آیت اللہ خمینی کے دست راست ڈاکٹر منتظر زیدی کی کتاب ''اصلاح الشیعہ'' اردو جو عربی نام سے عراق سے شائع ہوئی ہے، وہ ایک نظر ضرور دیکھ لیں ___ مرتب)

خلافت وامامت کا فرق

خلافت یا اسلامی حکومت کے حوالہ سے اہل سنت اور اہل تشیع کے اختلاف کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ اہل سنت کے ہاں یہ نظام خلافت کہلاتا ہے جبکہ اہل تشیع اسے امامت سے تعبیر کرتے ہیں اور خلافت وامامت میں چند اصولی اور بنیادی فرق پائے جاتے ہیں:

☆ امام نامزد ہوتا ہے اور خلیفہ امت کی صوابدید پر منتخب ہوتا ہے جیسا کہ اہل تشیع کے نزدیک جناب نبی اکرمؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا، جبکہ اہل سنت کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے تمام طبقات نے باہمی مشاورت اور اتفاق رائے سے حضرت

ابوبکرؓ کا انتخاب کیا تھا۔

☆ امام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اسی لیے وہ معصوم ہوتا ہے، مگر خلیفہ احکام اسلامی کے نفاذ اور حق حکمرانی استعمال کرنے میں اللہ تعالیٰ کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتا ہے۔ قاضی ابویعلیٰؒ نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی صاحب نے حضرت ابوبکرؓ کو **یا خلیفۃ اللّٰہ** کہہ کر خطاب کیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا کہ **لست بخلیفۃ اللّٰہ انا خلیفۃ رسول اللّٰہ** میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ امام اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے خود دلیل کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے، مگر خلیفہ جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتے ہوئے اپنے فیصلے اور حکم میں قرآن وسنت کی دلیل کا پابند ہے جیسا کہ صدیق اکبرؓ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے خطبہ میں یہ واضح کر دیا تھا کہ میں اگر قرآن وسنت کے مطابق چلوں تو میری اطاعت تم پر ضروری ہے اور اگر اس کے خلاف چلنے لگوں تو تم پر میری اطاعت ضروری نہیں ہے۔

☆ امام نسبی اور خاندانی ہے جیسا کہ اہل تشیع کے بارہ امام ایک ہی نسب اور خاندان سے ہیں مگر خلافت نسبی اور خاندانی نہیں ہے، اس لیے کہ چاروں خلفاء راشدین حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور ان کے بعد صحابہ کرامؓ کے دور میں بننے والے مسلمانوں کے متفقہ امیر المومنین حضرت معاویہؓ میں سے کوئی بزرگ بھی ایک دوسرے کا نسبی اور خاندانی وارث نہیں تھا، اگرچہ بعد میں مسلمانوں کی خلافت ہمیشہ خاندانی دائروں میں ہی چلتی آ رہی ہے لیکن حضرات صحابہ کرامؓ کے دور کا نظام خلافت جو آئیڈیل اور اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے، خاندانی اور نسبی خلافت کے دائرہ سے ہٹ کر تھا۔

☆ امام کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا مگر خلیفہ عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پہلے خطبہ میں فرما دیا تھا کہ اگر سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو لیکن اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو، یہ خلیفہ کا عوام کے سامنے جواب دہ ہونا ہے اور

عوام کا حقِ احتساب ہے جو خلافت راشدہ کے دور میں عملی طور پر موجود رہا ہے۔

☆ امام معصوم عن الخطاء ہے اس کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا مگر خلیفہ کی شرعی حیثیت مجتہد کی ہے جس کے بارے میں اصول یہ ہے کہ **المجتھد یخطئ و یصیب** اس لیے حضرات خلفاء راشدینؓ کے بہت سے فیصلوں سے ان کے سامنے اختلاف کیا جاتا تھا اور وہ درست ہونے کی صورت میں اختلاف کو قبول بھی کرتے تھے۔

☆ دورِ حاضر میں ایران کا دستور ''امامت'' کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے کہ امام غائب کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے ''ولایت فقیہ'' کو ان کے نمائندہ کی حیثیت دی گئی ہے اور ولایت فقیہ کے طور پر آیت اللہ خمینی اور ان کے بعد آیت اللہ خامنائی اس منصب پر فائز ہوئے ہیں، ان کے ساتھ ایک ''شوریٰ نگہبان'' ہے اور ولایت فقیہ اور شوریٰ نگہبان کو دستوری طور پر یہ حیثیت حاصل ہے کہ ان کے فیصلے حکومت، پارلیمنٹ، عدالت اور دیگر تمام شعبوں پر بالادستی رکھتے ہیں، وہ ان میں سے کسی کا فیصلہ بھی منسوخ کر سکتے ہیں، مگر ان کے فیصلے کو کسی جگہ چیلنج نہیں کیا جا سکتا، حکومت اور پارلیمنٹ وقفہ وقفہ سے منتخب ہوتی ہیں مگر ''ولایت فقیہ'' کا منصب تاحیات ہے۔

جبکہ سعودی عرب اور پاکستان کے دستور ''خلافت'' کے تصور کے قریب ہیں، سعودی عرب میں حاکمیت اعلیٰ قرآن وسنت کی ہے، حق حکمرانی آل سعود کو حاصل ہے مگر وہ قرآن وسنت کے مطابق حکومت کرنے کے پابند ہیں، پاکستان کے دستور میں حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی گئی ہے، حق حکمرانی عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہے اور حکومت اور پارلیمنٹ دونوں دستوری طور پر قرآن وسنت کے پابند ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۲ تا ۲۴

دفعہ نمبر ۲۲ تا دفعہ نمبر ۲۴ کے ضمن میں کوئی خاص بات کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

دفعہ نمبر ۲۵ (معاشرہ کی طبقاتی تقسیم)

البتہ دفعہ نمبر ۲۵ میں ''معیارِ زندگی'' اور ''معاشی تحفظ'' کے حوالہ سے بات کی گئی ہے، اس لیے

اس حوالہ سے کچھ معروضات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

☆ ''معیارِ زندگی'' کے بارے میں یہ بات سامنے رہنا ضروری ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کے بعد جب سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو اصحابِ شوریٰ نے دو اصولی فیصلے کیے، ایک یہ کہ چونکہ خلیفہ کے اوقات امورِ حکومت میں صرف ہوں گے اور وہ اپنا کوئی کاروبار وغیرہ نہیں کر سکیں گے اس لیے ان کے اور ان کے گھر کے اخراجات بیت المال کے ذمہ ہوں گے۔ اور دوسرا فیصلہ یہ کہ ان کے اخراجات کا تعین اس بنیاد پر ہوگا کہ وہ مدینہ منورہ منورہ کے ایک عام شہری کے معیار کے مطابق اپنے گھر کے اخراجات چلا سکیں، عام شہری سے مراد متوسط درجے کا شہری ہے اور فیصلے کے الفاظ میں یہ جملہ بہت زیادہ توجہ کا مستحق ہے کہ لا وکس فیھا ولا شطط نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں حکمرانوں اور عام شہریوں کا معیار زندگی یکساں ہونا چاہیے اور اسی بنیاد پر ''بیت المال'' سے حضرت صدیق اکبرؓ کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔

☆ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے سرکاری عمال پر پابندی لگا دی تھی کہ:

(۱) وہ اپنے گھر کے سامنے ڈیوڑھی نہیں بنا سکیں گے۔

(۲) ترکی گھوڑے پر سواری نہیں کریں گے۔

(۳) باریک لباس نہیں پہنیں گے اور

(۴) چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائیں گے۔

یہ اس دور میں معاشرتی امتیاز کی علامات تھیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمران طبقات کو عام شہریوں کے ساتھ معاشی برابری کے ساتھ معاشرتی برابری کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا۔

☆ بیت المال سے عام لوگوں کے وظیفے مقرر کرنے میں حضرت ابوبکرؓ کی رائے تھی کہ وہ برابری کی بنیاد پر ہونے چاہئیں، دینی درجات یا فضیلت کو وجہ ترجیح نہیں بننا چاہیے۔ جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ فضیلت اور درجات کے لحاظ سے وظائف کی درجہ بندی ہونی چاہیے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے دور میں وظائف کی تقسیم بالکل برابری کی بنیاد پر کی ہے مگر حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں یہ طریقہ تبدیل کر کے درجہ بندی کر

دی اور امہات المومنین، مہاجرین، انصار اور دیگر حوالوں سے مختلف گریڈ طے کر کے ان کی بنیاد پر وظائف تقسیم کیے۔ مگر امام ابو یوسفؒ نے ''کتاب الخراج'' میں لکھا ہے کہ آخری سال حضرت عمرؓ نے اس درجہ بندی کے معاشرتی نقصانات دیکھتے ہوئے یہ فرمایا کہ مجھے یہ بات سمجھ آئی ہے کہ اس کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کی رائے درست تھی۔ اس لیے اگلے سال سے اس کے مطابق عمل کروں گا۔ مگر اگلے سال سے پہلے حضرت عمرؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آ گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں معاشرتی طبقات اور درجہ بندی کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور معاشرتی یکسانیت قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

رفاہی ریاست کی بنیادیں

''بیت المال'' جناب نبی اکرمؐ کے دور میں ہی موجود تھا اور اس کے ذریعہ معاشرہ کے معذور اور ضرورت مند افراد کی مدد کی جاتی تھی، جناب نبی اکرمؐ بیت المال کی رقوم سے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرتے تھے اور تاوان میں پھنس جانے والے حضرات کی مدد بھی کرتے تھے، حتیٰ کہ ایک روایت میں مقتول کی دیت بھی بیت المال سے ادا کرنے کا ذکر ملتا ہے، بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ **من ترک مالا فلو ورثتہ و من ترک کلاً و عیالاً فإلیّ و علیّ** جو شخص مال چھوڑ کر مرا وہ اس کے وارثوں کو ملے گا اور جو بوجھ اور بے سہارا اولاد چھوڑ کر مرا وہ میری طرف رجوع کرے گا اور اس کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ میری طالب علمانہ رائے میں ''بیت المال'' کے ذریعہ سوسائٹی کے معذور، نادار، بے روزگار، ضرورت مند اور بوجھ تلے دبے لوگوں کی مدد کرنے اور ان کی کفالت کرنے کی بنیاد رسول اللہؐ کے اسی ارشاد گرامی **فإلیّ و علیّ** پر ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اسی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے بیت المال کے نظام کو اس قدر منظم کیا کہ خلافت راشدہ کا دور آج بھی ویلفیئر سٹیٹ اور رفاہی ریاست کے لیے آئیڈیل تصور کیا جاتا ہے اور بہت سے مغربی ممالک اس کے بعض حصوں کی پیروی کر رہے ہیں، حتیٰ کہ ناروے میں اس سلسلہ کے بعض قوانین اور وظیفے

حضرت عمرؓ کے نام کے ساتھ رائج کیے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست صحیح معنوں میں ایک فلاحی ریاست ہے جو مملکت کے تمام باشندوں کی ضروریات زندگی فراہم کرنے اور ان کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور اس سلسلہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کا یہ تاریخی جملہ ایک راہ نما اصول کا درجہ رکھتا ہے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے پر کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو عمرؓ سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

آئیڈیل ویلفیئر اسٹیٹ

ایک اسلامی رفاہی ریاست میں ''بیت المال'' کا کردار کیا ہے، اس کے حوالہ سے امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور کا ایک واقعہ امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ نے ''کتاب الاموال'' میں بیان فرمایا ہے جو ایک اسلامی ریاست کے رفاہی پہلو کی وضاحت کرتا ہے۔

ان کے دور میں عراق کے گورنر عبد الحمیدؒ نے امیر المومنین کو خط لکھا کہ اس سال صوبہ میں بیت المال کو جو آمدنی ہوئی ہے اس سے سال بھر کے اخراجات پورے کرنے کے بعد کچھ رقم بچ گئی ہے اس کے بارے میں فرمائیں کہ کیا کیا جائے؟ امیر المومنین نے جواب دیا کہ صوبہ میں اعلان کر کے جو حضرات مقروض ہیں اور اپنے قرضے ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ان کے قرضے بیت المال سے ادا کر دو۔ گورنر کا جواب آیا کہ یہ کام کر چکا ہوں اس کے باوجود زائد رقم موجود ہے۔ امیر المومنین کا دوسرا خط آیا کہ سروے کر کے معلوم کرو کہ جو لڑکے اور لڑکیاں شادی کے قابل ہیں اور اخراجات میسر نہ ہونے کی وجہ سے شادیاں نہیں کر سکتے ان کی شادیاں بیت المال کی طرف سے کرا دو۔ گورنر صاحب نے لکھا کہ یہ بھی کر چکا ہوں، رقم پھر بھی بچ گئی ہے، امیر المومنین نے لکھا کہ وہ شادی شدہ حضرات جو بیوی کا مہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ان کے مہر بیت المال سے ادا کر دو۔ گورنر عبد الحمیدؒ نے لکھا کہ یہ بھی کر چکا ہوں، امیر المومنینؒ نے پھر لکھا کہ بے آباد زمینوں کا سروے کرا کے انہیں آباد کرنے کے لیے زمین داروں کو آسان قسطوں پر قرضے دے دو۔

یہ بات بظاہر عجیب سی لگتی ہے لیکن تاریخی حقیقت ہے اور ایک اسلامی ریاست میں ''بیت المال'' کے کردار کی وضاحت کرتی ہے، ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ اسلام کے یہ سنہری اصول اور خلافت راشدہ اور خلافت اسلامیہ کی یہ زرّیں روایات رفاہی ریاست کے حوالہ سے غیر مسلم حکومتوں کی توجہ تو حاصل کر رہی ہیں لیکن مسلم ممالک بالخصوص اسلام کے نام پر قائم ہونے والی ریاست ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے حکمرانوں کی اس طرف توجہ نہیں ہے۔

زنا کا چور دروازہ

دفعہ نمبر ۲۵ کی دوسری شق میں زچہ اور بچہ کی امداد کے حوالہ سے بات کی گئی ہے اور یہ وضاحت کی گئی ہے کہ بچہ شادی کے نتیجے میں پیدا ہو یا بغیر شادی کے، دونوں صورتوں میں یکساں سلوک کا مستحق ہوگا۔ ہمیں بچے کے بارے میں تو کوئی کلام نہیں ہے کہ اس کا کوئی قصور نہیں ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک درست طرز عمل نہیں ہے، لیکن زچہ کے بارے میں دونوں صورتوں میں برابر کے سلوک کی بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اور اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ بغیر شادی کے بچوں کی صورت میں بھی زچہ کو قانونی طور پر برابر کے سلوک کا حقدار قرار دیا جا رہا ہے۔ جبکہ اسلام ان دونوں صورتوں میں فرق کرتا ہے اور شادی کے بغیر بچے کو جنم دینے والی زچہ اور اس کے ساتھ ناجائز سلوک قائم کرنے والا مرد دونوں اسلام کی نظر میں مجرم ہیں اور ان کے لیے سزا مقرر ہے۔

جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں ایک عورت آئی کہ اس نے زنا کیا ہے اور زنا سے پیدا ہونے والا بچہ اس کی گود میں ہے، اس لیے اسے سزا دی جائے، نبی اکرمؐ نے اس سے فرمایا کہ بچے کا تو کوئی قصور نہیں ہے، جاؤ بچے کو دودھ پلاؤ، جب اس کو تمہارے دودھ کی ضرورت نہیں رہے گی تو پھر آنا۔ روایت میں ہے کہ وہ ایک عرصہ کے بعد بچے کو لے کر آئی جس کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا اور وہ اسے کھا رہا تھا، اس نے کہا کہ اب یہ بچہ روٹی کھا لیتا ہے اور اسے میرے دودھ کی ضرورت نہیں رہی، اس لیے اب مجھ پر سزا نافذ کی جائے، چنانچہ نبی اکرمؐ نے اس عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے زنا کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کو تحفظ فراہم کیا ہے اور اس کے تحفظ کی حد تک اس کی ماں کو بھی سہولت دی ہے لیکن اس ماں کے

جرم کو معاف نہیں کیا اور اسے سزا دی ہے، اس لیے زچہ بچہ دونوں کے لیے یکساں معاشرتی تحفظ کی بات اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے۔

دفعہ نمبر ۲۶ تا ۲۹

دفعہ ۲۶ تا ۲۹ کے بارے میں بھی ہم کوئی بات کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

دفعہ نمبر ۳۰

البتہ دفعہ نمبر ۳۰ قابل توجہ ہے کہ اس میں اقوام متحدہ کے رکن ممالک واقوام کو اس بات کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ ہر حال میں اس چارٹر کی پابندی کریں گے اور اس چارٹر میں بیان کردہ آزادیوں اور حقوق کی کوئی ایسی تعبیر بھی نہیں کر سکیں گے جو اس چارٹر کے مرتب کرنے والوں کے مقصد اور منشا کے خلاف ہو۔

ہم نے انسانی حقوق کے اس چارٹر کی مختلف دفعات پر تبصرہ کرتے ہوئے صرف اس پہلو کو سامنے رکھا ہے کہ ان اہم باتوں کی نشاندہی ہو جائے جو ہماری طالب علمانہ رائے میں اسلامی تعلیمات کی رو سے محل نظر ہیں اور جنہیں من وعن قبول کرنا قرآن وسنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہوئے ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ باقی رہیں یہ تفصیلات کہ ان پر دلائل اور تاریخی پس منظر کی روشنی میں مدلل بحث کی جائے، یہ کام ہمارے علمی مراکز اور دینی اداروں کا ہے۔ اللہ کرے کہ ہمارے علمی ودینی مراکز اس کی طرف مناسب توجہ دے سکیں۔ آمین یارب العالمین۔

ابوعمار زاہد الراشدی ____ نزیل مکہ مکرمہ
۹ رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ / ۲۸ جولائی ۲۰۱۲ء